معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس[۲۵] پونڈ یا چالیس ڈالر[۴۰]

بحری ڈاک نو[۹] پونڈ یا چودہ ڈالر[۱۴]

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷/اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 — Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، چک بھیجنے کی صورت میں پچاس روپے مزید ارسال کریں، چک یا بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

☆ DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا، رقم پیشگی آنی چاہیے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۷ ماہ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۰۶ء عدد ۵

فہرست مضامین

email: shibli_academy@rediffmail.com :ای میل

شذرات

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور مرکزی حکومت نے یونی ورسٹی کے متعلق الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں جو اپیل دائر کی تھی، اسے قبول کرتے ہوئے اس کی ایک دورکنی بنچ نے ۲۴/اپریل ۲۰۰۶ء کو ہدایت جاری کی ہے کہ تاحکم ثانی یونی ورسٹی کا وہ موقف برقرار رہے گا جو الہ آباد ہائی کورٹ میں رٹ درخواست کے داخل کیے جانے کے وقت تھا یعنی ۱۹۸۱ء میں کی گئی آئینی ترمیم کے بہ موجب مسلم یونی ورسٹی بہ دستور ایک اقلیتی ادارہ رہے گی، تاہم فاضل عدالت نے مسلم طلبا کے لیے ۵۰ فی صد نشستوں کے رزرویشن پر تعلیمی سال ۰۷-۲۰۰۶ء میں عمل کرنے پر پابندی لگادی ہے اور یونی ورسٹی انتظامیہ سے حلف نامہ لے کر اس کا پابند کردیا ہے کہ وہ سال رواں میں مسلم طلبا کو ۵۰ فی صد رزرویشن نہیں دے گی اور سب معاملات پانچ رکنی آئینی بنچ کو سپرد کردیا ہے، یہ عبوری فیصلہ بھی مسلمانوں کے لیے مژدہ ہے، عام طور پر مسلم لیڈروں نے اس کا خیر مقدم کیا ہے، یونی ورسٹی کے لائق وائس چانسلر کا بیان ہے کہ ہماری رٹ درخواست کو قبول اور اسے ایک وسیع تر بنچ سے رجوع کرکے سپریم کورٹ نے اس تاریخی ادارہ کی ابتدا سے متعلق دعووں کو ثابت کرنے کے لیے ایک منصفانہ موقع دیا ہے، آج کا عبوری حکم ہمارے لیے ایک بڑی فتح ہے اور اس سے عزیز پاشا کیس میں سپریم کورٹ کے ۱۹۶۸ء کے فیصلے پر نظر ثانی سے متعلق ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ۴/اکتوبر ۲۰۰۵ء اور ۵/جنوری ۲۰۰۶ء کو الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلوں میں مسلم یونی ورسٹی کو اقلیتی ادارہ ماننے اور مسلم طلبا کو ۵۰ فی صد رزرویشن دینے سے اس بنا پر انکار کیا گیا تھا کہ ۱۹۶۸ء کے عزیز پاشا کیس میں سپریم کورٹ نے یونی ورسٹی کو اقلیتی ادارہ نہیں مانا تھا جس کو رد کرکے ۱۹۸۱ء میں محض حکومت کے ترمیمی ایکٹ کے تحت اقلیتی ادارہ قرار دے دیا گیا تھا، چنانچہ ہائی کورٹ کے فیصلوں سے مسلمانوں اور یونی ورسٹی کے ہمدردوں

میں بڑی خلش اور بے چینی پیدا ہوگئی تھی جو سپریم کورٹ کے تازہ فیصلے سے کم تو ہوئی ہے مگر ابھی بے یقینی کی کیفیت اور خطرے اور اندیشے اپنی جگہ پر برقرار ہیں کیوں کہ یونی ورسٹی نے مرکزی حکومت کی منظوری سے گزشتہ سال ۵۰ فی صد رزرویشن کی جو پالیسی طے کی تھی، اس پر عمل کو روک دیا گیا ہے اور ابھی مکمل حتمی فیصلہ آنا باقی ہے تاہم ماہرین پر امید ہوگئے ہیں اور ہم بھی، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ یہ مہم کامیاب ہو اور مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا ملی سرمایہ ہر دست برد سے محفوظ اور اپنی خصوصیات کے ساتھ قائم و باقی رہے اور مسلمان بے روک ٹوک اس سے ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہیں۔

ہمیں یک حرف از یونی ورسٹی مدعا باشد   کہ ایں سر رشتہ تعلیم ما در دست ما باشد

اس وقت علی گڑھ شہر کے فساد کی دردانگیز یاد بھی آگئی جس سے یونی ورسٹی بھی متاثر ہوئی، امتحانات اور بعض دوسرے پروگرام موخر کرنے پڑے مگر ہمیں خوشی ہے کہ میڈیکل کالج کے ڈاکٹروں نے قابل ستائش خدمات انجام دیں اور اسٹاف اور طلبا نے بھی پورا تعاون کیا، جوں جوں اتر پردیش اسمبلی کے انتخابات کا زمانہ قریب آرہا ہے، فساد کرانے کی سازشیں تیز ہوتی جارہی ہیں، رتھ یاترائیں اسی لیے نکالی گئی ہیں جن کا نام سرکشا رکھا گیا ہے مگر ان کا اصل مقصد فرقہ وارانہ زہر پھیلانا ہے، جس کا انداز رتھ نکالنے والوں کی غیر ذمہ دارانہ تقریروں سے ہوتا ہے، علی گڑھ کے فساد کو رتھ یاتراؤں کی دین کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہ وہ منظم اور منصوبہ بند اقلیتی فرقہ کے خلاف پولیس ایکشن تھا، مقتول اور زخمی اسی فرقے کے تھے سوائے ایک کے اور وہ بھی غلطی اور دھوکے سے۔ سب کو گولیاں جسم کے اوپر کے حصے میں لگی ہیں، پولیس اور انتظامیہ کی غفلت اور نااہلی ہی نہیں، اس کی صریح زیادتی اور تعصب بھی اس میں کارفرما تھا، پولیس فائرنگ بلاوجہ تھی۔

قومی اقلیتی کمیشن نے بھی ضلعی انتظامیہ کو مورد الزام گردانا ہے اور کہا ہے کہ انٹلی جنس کی مکمل ناکامی کی وجہ سے فرقہ وارانہ فساد بھڑکا، تعجب ہے کہ تقریباً مہینے بھر تک جاری رہنے والے مئو اور علی گڑھ کے یہ فسادات ایسی سیکولر حکومت کے دور میں ہوئے ہیں جو اقلیت نواز بھی جاتی ہے مگر اب اقلیتوں کے معاملے میں اس کی بے حسی اور سرد مہری کے کئی واقعات سامنے آرہے ہیں، اس

نے ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کو بنیاد بنا کر یونانی میڈیکل کالج بند کردیے اور ان کے فارغین کی پریکٹس روک دی، اس سے فریاد کی گئی تو سنی ان سنی کردی، مایوس ہونے پر سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی تو اس نے حکومت اور ہیلتھ سکریٹری کے نام نوٹس جاری کرکے ایک ماہ کے اندر حکومت سے جواب طلب کیا ہے، قومی اقلیتی ترقیاتی کمیشن کے چیرمین قاری محمد میاں مظہری نے یوپی حکومت کو اس کے لیے مطعون کیا ہے کہ اس نے افسر شاہی کو کھلی چھوٹ دے کر اور امتیازی روش اختیار کرکے مسلمان دست کاروں اور غریب بنکروں کو خستہ حال بنادیا ہے، فلمی صنعت کے فروغ اور بھاری صنعتوں کے قیام کے نام پر جہاں ہزاروں کروڑوں روپے کے پروجیکٹ پایہ تکمیل کو پہنچ رہے ہیں، وہاں ریاست کے غریب مسلم صنعت کاروں اور لاکھوں بنکروں کی اقتصادی پس ماندگی دور کرنے پر کوئی بھی توجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ملک کی قدیم اور ممتاز دینی درس گاہ ہے، علامہ شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے تعلیمی مشن کا فروغ اس کا خاص مقصد ہے، ملک کے مشہور عالم و مصنف اور جماعت اسلامی ہند کے صف اول کے رہنما مولانا صدر الدین اصلاحی مرحوم کی تعلیم اسی درس گاہ میں ہوئی تھی، ان پر مدرسۃ الاصلاح کی انجمن طلبائے قدیم نے ۲۷ر تا ۲۹ر اپریل ۲۰۰۶ء کو ایک باوقار سمینار کرایا، جو ہر اعتبار سے کامیاب رہا، اس میں قرب وجوار کے اہل علم اور مولانا کے عزیزوں اور قدردانوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی، حیدرآباد، دہلی، رام پور، علی گڑھ اور لکھنؤ کے مدارس و جامعات کے علاوہ دارالمصنفین، مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح کے علما اور پروفیسر حضرات نے مقالات پڑھے اور مولانا کے حالات و کمالات، افکار و خیالات پر بحث و تبصرہ کیا، ان کی تصنیفات کا تنقیدی و تحلیلی تجزیہ کرکے ان کی دینی و علمی خدمات، قرآنیات سے شغف اور امام ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افکار کی اشاعت میں ان کی مساعی کا ذکر کیا، مقالات پر سوال و جواب بھی ہوئے، سمینار کی وجہ سے مدرسہ میں تین روز بڑی چہل پہل رہی، طلبہ و اساتذہ نے مہمانوں کی خاطر تواضع اور آرام و راحت کا پورا خیال رکھا جس کے لیے وہ قابل ستائش ہیں۔

☆☆☆

مقالات

علامہ محمود شاکر کی تفسیر طبری کی تحقیق
اور قرآن مجید سے متعلق ان کی آراء

از:- پروفیسر محمد راشد ندوی☆

عربی زبان وادب اور اسلامی علوم وفنون کے ہر طالب علم کو ابن جریر طبری کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلومات ہوتی ہیں، کچھ ان کو مورخ کی حیثیت سے جانتے ہیں اور کچھ ان کو مفسر کی حیثیت سے اور کچھ ان کو عام اسلامی علوم وفنون کے ماہر کی حیثیت سے اور یہ حقیقت ہے کہ طبری کی زندگی اور ان کی تصانیف کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو یقین نہیں ہوتا کہ ایک شخص نے کیسے مختلف موضوعات پر اتنی کثیر گراں قدر تصانیف چھوڑی ہیں، کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ان کے علمی کارناموں کا مقابلہ آج کے زمانے میں قائم بڑی سے بڑی علمی اکیڈیمیاں بھی نہیں کرسکتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں مروج تمام علوم وفنون کا انتہائی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا تھا اور انہیں پوری طرح سے ہضم کرلیا تھا، اس کی واضح دلیل ان کی تحریریں اور ان میں پیش کردہ خیالات وافکار ہیں جن کا مطالعہ کرنے والا ان میں ابتکار، ندرت اور جدت کی اعلا مثالیں پاتا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کا مصنف اپنی معلومات کی وسعت کے لحاظ سے ایک بہت بڑا کتب خانہ ہے اور اشاروں، کنایوں میں بہت سی کتابوں اور مصنفین کی نشان دہی کردیتا ہے۔

ابن جریر طبری ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۰ھ میں ان کا انتقال ہوا، قدرت نے انہیں

☆ سابق صدر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔

ایک طویل عمر عطا کی تھی، انہوں نے اپنی زندگی کے ہر لمحے سے پورا فائدہ اٹھایا اور اس سے جو کچھ حاصل کیا اسے آیندہ آنے والی نسلوں کے حوالہ کردیا، اس طرح یہ ایک ایسا صدقۂ جاریہ بن گیا جس کا فیض تاقیامت باقی رہے گا۔

ابن جریر کے ترجمہ نگاروں نے ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست بیان کی ہے لیکن اتفاق سے ان میں سے دو تصانیف حوادث زمانہ سے محفوظ رہ سکی ہیں، پہلی ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' اور دوسری ''تاریخ الامم والملوک''، اگر ان کی صرف یہی دو تصانیف ہوتیں تو ان کے علمی تبحر اور عظمت کے لیے کافی تھیں، یہ دونوں آج تک تفسیر اور اسلامی تاریخ پر کام کرنے والوں کے لیے مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں، اس مقالے میں ہم انتہائی اختصار کے ساتھ ان کی تفسیر ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' کا ذکر کریں گے، اس کے بعد اس کتاب کو علمی و تحقیقی شکل میں معرض وجود میں لانے میں علامہ محمود شاکر کا جو عظیم الشان کارنامہ ہے، اس پر بحث کریں گے۔

تفسیر طبری جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے، دراصل قرآنیات کا انسائیکلوپیڈیا ہے، کوئی شخص فہم قرآن کا دعوا کرے اور اس نے تفسیر طبری کا مطالعہ نہ کیا ہو تو اس شخص کی بات کی صداقت مشکوک ہوگی، اس تفسیر کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ موصوف نے تیسری صدی ہجری تک قرآن مجید کی جو تفسیریں گئی لکھی تھیں اور قرآنی علوم سے متعلق جو دیگر تصانیف تھیں ان سب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا، چنانچہ انہوں نے ہر زمانے اور ہر علاقے کے علما کی مختصر سے مختصر تصنیف کا حوالہ دیا ہے، ان کا طریقہ تفسیر یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے آنحضور ﷺ کے اقوال، اس کے بعد صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے اقوال نقل کرتے ہیں پھر ہر آیت اور اس کے مشکل لفظ پر اپنی رائے پیش کرتے ہیں، وہ اپنی رائے کی سند کے لیے جاہلی دور کے شعرا سے لے کر بعد کے معتبر شعرا کے کلام سے استشہاد کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اہل لغت کی آرا نقل کرتے ہیں اور امثال و حکم کو بہ طور دلیل اور شہادت کے پیش کرتے ہیں، وہ اپنی بات کو جس انداز میں پیش کرتے ہیں وہ اتنا سادہ اور آسان ہوتا ہے کہ پڑھنے والا قرآن مجید کی سحر انگیزی اور تاثیر کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کی ادبی چاشنی اور جاذبیت سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے، اس طرح وہ ان مفسرین سے بالکل الگ اور ممتاز نظر آتے ہیں جو فصیح و بلیغ قرآنی آیات کی تفسیر و توضیح کے

دوران تراکیب والفاظ کے پیچ وخم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں جس کے باعث وہ نہ تو قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے جلوے اجاگر کر پاتے ہیں اور نہ ہی قارئین تک اپنی باتیں منتقل کر سکتے ہیں، جب ہم ابن جریر کی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں اور وہ تنقید دیکھتے ہیں جو انہوں نے اہل لغت کی آرا پر کی ہے اور وہ شواہد دیکھتے ہیں جو انہوں نے اپنی بات کی تائید کے لیے کلام عرب سے پیش کیے ہیں، اسی طرح نحو وصرف کے مسائل سے تعرض کا ان کا انداز دیکھتے ہیں تو بے ساختہ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کی گرفت صحابہ کرام کے اقوال سے لے کر ہر دور کے اساتذہ فن کی تحقیقات پر بے حد گہری تھی، بلاشبہ تفسیر طبری چوتھی صدی ہجری تک کے اسلامی علوم وفنون اور عربی زبان و ادب کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جس کا قاری کسی منزل پر اکتاتا نہیں ہے اور اسے ہر صفحے پر نئی چیز نئے انداز میں نظر آتی ہے۔

اس دور کے علما کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے قدیم دور کے علما کی تصانیف کو طبع کر کے لوگوں کے سامنے پیش کردیا ہے اور ظاہر ہے جو قلمی نسخے (مخطوطات) انہیں دست یاب ہوئے ہوں گے یا جو دوسرے نسخے انہیں ملے ہوں گے ان سب کا موازنہ کر کے اور حتی الامکان ان کی تصحیح کر کے انہوں نے انہیں طبع کرانے کی کوشش کی ہے، لیکن ان تمام اہتمامات کے باوجود ان مخطوطات میں غلطیوں کے باقی رہنے کی مثالیں پائی گئی ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ ''کوئی بھی کتاب مصنف کی اصل تحریر کے مطابق چھپی ہے'' بہت مشکل امر ہے، اس کے باوجود ہم ان علما کے احسانات کو فراموش نہیں کر سکتے جنہوں نے اس طرح کی کتابیں شائع کر کے اسلامی علوم وفنون کے عظیم الشان ذخیرہ کو ہم تک پہنچایا ہے۔

تیس جلدوں پر مشتمل ابن جریر کی تفسیر اس بات کی مستحق تھی کہ اسے تحقیق و تخریج اور تصحیح واستدراک کے ساتھ شائع کیا جائے، اتفاق سے مصر کے ایک موقر ادارہ ''دار المعارف'' کے مدیر (ڈائرکٹر) کے ذہن میں اس کی اشاعت کا خیال آیا، اس سلسلہ میں انہوں نے مصر کے دو محقق اور ادیب احمد شاکر اور محمود شاکر سے بات کی، ایسا لگتا ہے کہ دار المعارف کے مدیر کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا کہ ان کی نظر ان دو ایسے محققین پر پڑی جنہیں اس دور میں اپنے فن میں امامت کا درجہ حاصل تھا، احمد شاکر جو مصر کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) میں جج تھے

اور عدلیہ کے کاموں کو عالمانہ اور مجتہدانہ انداز میں انجام دے رہے تھے اور مصر میں ان کے فیصلوں کو بہ طور سند اور نظیر پیش کیا جاتا تھا، عدالت عالیہ کے ان مہتم بالشان کاموں کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیفی اور تحقیقی سرگرمیاں بھی جاری تھیں اور انہوں نے ادب، لغت، تاریخ اور تراجم پر مشتمل درجنوں کتابوں کی تحقیق، تصحیح اور تخریج کی تھی، اس میدان میں ان کی سب سے بڑی خدمت مسند احمد بن حنبل کی تحقیق و تخریج ہے جسے حدیث سے شغف رکھنے والے علما و فضلا نے اس دور کا عظیم الشان کارنامہ قرار دیا ہے، اس پروجیکٹ سے وابستہ دوسری شخصیت محمود شاکر کی ہے جو اپنے بھائی ''احمد شاکر'' سے تقریباً سولہ سال چھوٹے ہیں، ان کو وہ اپنا بڑا بھائی، استاد، معلم اور مربی تصور کرتے تھے اور اپنے علمی سفر میں ہر مرحلہ میں ان سے مدد لیتے تھے، محمود محمد شاکر ۱۹۲۰ء تک مصر کی علمی دنیا میں ایک ادیب، ناقد، شاعر، محقق اور مصنف کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے، ان کی تصنیف ''حیاۃ المتنبی من شعرہ'' اور ان کے ذریعہ ''طبقات فحول الشعرا'' اور ''نسب قریش'' کی تحقیق و تخریج کے بعد ان کی اشاعت نے ان کی عالمانہ اور محققانہ شخصیت کے اعتبار و اعتراف کا ناقابل انکار ثبوت فراہم کر دیا تھا، ان کے علاوہ اس دور کے تقریباً تمام علمی و ادبی رسالوں میں ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالات و مضامین شائع ہو رہے تھے، ان سب کی وجہ سے وہ بہت کم عمری میں اپنے علم و فن کے لحاظ سے طبقہ علیا میں شمار ہونے لگے تھے، یہاں تک کہ ہمارے استاد علامہ پروفیسر عبدالعزیز میمنؒ کی یہ رائے تھی کہ ''علمی اعتبار سے دنیائے اسلام میں ان کے معاصرین میں سے کوئی ان کا ہم پلہ نہیں ہے''۔

اس طرح مصر کے دو مایہ ناز محققین احمد شاکر اور محمود شاکر نے ایک ساتھ مل بیٹھ کر اور ایک دوسرے کا تعاون لے کر تفسیر طبری کی تحقیق و تخریج کا مہتم بالشان کارنامہ انجام دیا، یہ عجیب بات ہے کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کو اپنے سے فائق اور بڑا سمجھتے تھے اور دونوں کو ایک دوسرے پر فخر تھا، اسے ان کی خاکساری کہیے یا علم دوستی، بہرصورت ان دونوں کی مشترکہ کوششوں سے اس اہم تفسیر کی تحقیق و تخریج کا کام پایہ تکمیل تک پہنچا، یہ حسن اتفاق ہے کہ جب اس تفسیر کی تحقیق، تخریج اور اشاعت کے منصوبے (دارالمعارف مصر کے ذریعہ) کی خبر عالم اسلام میں عام ہوئی تو حکومت سعودیہ عربیہ کے اہل علم حضرات نے اپنی حکومت کو اس کی تکمیل

میں مالی تعاون کی پیش کش کے لیے آمادہ کرلیا، اس طرح قدرت نے اس تفسیر کی تحقیق اور اشاعت کے لیے جو بہترین صورتیں اور انتظامات ممکن تھے، ان سب کو فراہم کر دیا یعنی دنیائے اسلام کا سب سے موقر علمی ادارہ ''دارالمعارف''، دنیائے اسلام کے مایہ ناز محققین - احمد شاکر اور محمود شاکر اور دنیائے اسلام کی سب سے علم دوست اسلامی حکومت سعودیہ عربیہ کا مالی تعاون، اس کے بعد یہ بات یقین سے کہی جاسکتی تھی کہ اس عظیم الشان کام کو عظیم الشان انداز میں معرض وجود میں لانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

۱۹۵۹-۱۹۶۰ء کا زمانہ تھا جب میں مصر میں تھا اور محمود شاکر کے دولت خانہ پر جو ایک علمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، روز حاضری دیا کرتا تھا اور ان سے اور ان کے کتب خانے سے جہاں تک ممکن تھا، فائدہ اٹھاتا تھا، اس دوران مختلف مواقع پر مجھے ان کی جانب سے جو رہنمائی، محبت اور شفقت حاصل ہوتی تھی اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، اس زمانے میں جب تفسیر طبری کا مسودہ دارالمعارف سے ان کے پاس تحقیق و تصحیح کے لیے آیا کرتا تھا ان کا معمول تھا کہ وہ شام میں اپنے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت کے سامنے اس مسودہ کی عبارتوں کو بلند آواز میں پڑھا کرتے تھے اور اپنے تحقیقی و تصحیحی اور تخریجی حواشی اور نوٹس سے انہیں آگاہ کرتے تھے، اس وقت ان کے پاس بیٹھے طلبہ ان کی محنت اور کاوش پر سر دھنتے تھے۔

محمود شاکر نے تفسیر طبری کی پہلی جلد کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انہیں بچپن ہی سے تفسیر طبری سے بڑا شغف تھا اور انہوں نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور مطالعہ کے دوران جہاں کہیں بھی انہیں شک یا شبہ ہوا تھا اس پر نشان لگالیا تھا، اس وقت بھی ان کا خیال تھا کہ اس تفسیر میں جا بجا غلطیاں ہیں جن کی وجہ سے انہیں کہیں کہیں مصنف کی بات سمجھنے میں دشواری ہوئی تھی اور کہیں خلط مبحث ہوا، مزید برآں کہیں کہیں خاص طور سے روایات کے باب میں خود مصنف سے سہو ہوا تھا، ان سب کی تصحیح کا خیال اور اس کی ضرورت کا احساس انہیں بہت پہلے سے تھا، ہم سب اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ تفسیر طبری میں روایات اور اقوال سلف کے ساتھ ساتھ جاہلی اور اسلامی دور کے شعرا کے ہزاروں اشعار شواہد کی حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں، اتفاق سے ان سے ان اشعار کے نقل کرنے میں بعض مقامات پر تسامح ہوگیا ہے، اسی طرح خود ان میں سے

بعض اشعار سے طبری نے جو استشہاد کیا ہے وہ بھی محمود شاکر کی نظر میں محل نظر تھا، ان سب وجوہ کی بنا پر ان سے جب اس کتاب کی تصحیح و تحقیق کی گزارش کی گئی اور ساتھ انہیں یہ اطلاع بھی دی گئی کہ ان کے بڑے بھائی نے احادیث کی تخریج کی ذمہ داری لے لی ہے تو وہ اس کام کے لیے بہ خوشی راضی ہو گئے، میری نظر میں ان کی یہ رضامندی دراصل ان کی ایک دلی تمنا اور آرزو کی تکمیل کا مظہر تھی۔

عصر حاضر میں تحقیق و تخریج کی روایت کا آغاز یورپ سے ہوا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اہل یورپ نے جن ادبی، علمی اور تاریخی کتابوں کی تحقیق و تخریج کا کام کیا ان میں انہوں نے بے پناہ محنت اور جاں فشانی کا مظاہرہ کیا، ان کی اس عرق ریزی اور مشقت کا عربی زبان کے ہر طالب علم کو اعتراف ہے اور وہ ہمیشہ ان کا ممنون و مشکور رہے گا، یورپ کے ان علما اور محققین (مستشرقین) کے ان تحقیقی اور تخریجی اعمال کے پیچھے کیا عزائم اور کیا نیتیں تھیں؟ بعض مسلم علما نے ان کے تعلق سے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے، میرا خیال ہے کہ ہمیں ان کی نیتوں اور ارادوں پر بحث اور جرح کے بجائے ان کے کاموں کی عظمت اور اہمیت پر نظر ڈالنی چاہیے، کسی کتاب کی تحقیق و تخریج سے متعلق عام طور سے یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر اس کے کئی قلمی نسخے دست یاب ہو جائیں اور کوئی شخص ان کا موازنہ اور مقابلہ کرنے کے بعد ان میں مذکور اشعار و امثال وغیرہ کی کسی حد تک تخریج کر دے اور پھر وہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو جائے تو گویا تحقیق و تخریج کا حق ادا ہو گیا، میرے نزدیک یقیناً یہ ایک لائق تحسین کام ہوگا اور اس کی قدر کی جانی چاہیے لیکن تحقیق و تخریج کے کچھ بنیادی آداب، شرائط اور لوازم ہیں، جدید علمی ترقیوں نے فن تحقیق و تخریج کو بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے، اس لیے ہمارے درمیان جو اہل علم ہیں وہی اس کام کے لیے آگے بڑھیں، انہیں ان اصول و ضوابط اور طریق ہائے کار کو ملحوظ رکھنا ہوگا، میرا یہ خیال بھی ہے کہ تحقیق و تخریج کے کام کی اہمیت تصنیف و تالیف کے کام سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ بعض پہلوؤں سے تحقیق و تخریج کا عمل زیادہ مشکل اور کارآمد ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں محقق اور مصنف کے درمیان ذہنی اور فکری یکسانیت کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح جس علم یا فن سے متعلق اصل کتاب (مخطوطہ) ہو اس پر محقق کی پوری دست رس ہونی چاہیے، اگر ان دونوں

بنیادی باتوں میں محقق مصنف سے کسی اعتبار سے بھی کم تر ہو گیا تو اس کے تحقیقی و تخریجی عمل کو قبولیت اور شہرت حاصل نہیں ہو سکتی، کیوں کہ مصنف جن راہوں سے گزرا ہو اگر محقق ان سے بے خبر ہو بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ ان کے قدموں کے نشانات سے پوری طرح واقف نہ ہو تو اس کے تحقیقی و تخریجی عمل کی کما حقہ تکمیل ناممکن ہوگی، میں اس سے آگے بڑھ کر اس رائے کا قائل ہوں کہ محقق کی نظر مصنف کی نظر سے زیادہ عمیق اور تیز ہونی چاہیے کیوں کہ اس کا کام اس سے صادر ہونے والی غلطیوں کی اصلاح ہے وہ غلطیاں چاہے زبان کی ہوں یا مراجع و مصادر کی، یہ حقیقت ہے کہ اگر محقق کی نظر مصنف کی نظر سے زیادہ گہری نہیں ہوگی تو وہ ان کی نشان دہی اور اصلاح سے قاصر رہ جائے گا اور اس طرح اپنے فرض منصبی یعنی اصلاح و تصحیح میں کوتاہی کا مرتکب ہوگا، اگر اس اعتبار سے غور کیا جائے تو مصر کے ان دونوں محققوں نے جنہوں نے تفسیر طبری کی تحقیق و تخریج کا کام اپنے ذمہ لیا تھا فی الواقع ان کو اپنے علم و فن میں کمال اور امامت کا درجہ حاصل تھا، احمد شاکر جنہوں نے مسند احمد بن حنبل پر کام کیا تھا، ان کے پیش نظر احادیث کے بہت سے ایسے مجموعے رہے ہوں گے جن کی خبر طبری کو بھی نہیں رہی ہوگی، کیوں کہ طبری کے بعد حدیث اور اس کے دیگر فنون سے متعلق سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں جو موجودہ زمانے میں طباعت اور ترسیل کی آسانیوں کے باعث ہر طرف موجود ہیں اور ان سے استفادہ سب کی دست رس میں ہے، اس لیے اس حقیقت کا انکار ناممکن ہے کہ آج کے محقق کو جو وسائل و ذرائع میسر ہیں وہ طبری کو کبھی نصیب نہیں ہوئے، انہوں نے اپنے زمانے تک کی تصنیف شدہ کتابوں کے مطالعہ کے لیے جو یقیناً مخطوطات کی شکل میں تھیں، طبرستان سے عراق، عراق سے شام اور شام سے مصر اور فلسطین کا سفر کیا تھا اور ان مقامات پر موجود علمی خزانوں کو دیکھنے اور وہاں کے اہل علم سے ملاقات کرنے کی کوشش کی تھی، تاہم اس کے باوجود چوں کہ یہ ایک فرد واحد کی سعی و کوشش تھی اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ معلومات کی کمی، سفر کی صعوبت یا دست رس کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی تصانیف ان کے مطالعہ میں نہ آسکی ہوں، بیسویں صدی میں ان میں سے بہت سی کتابیں طبع ہو کر آگئی ہیں، اس لیے ان میں سے حدیث سے متعلق کتب سے احمد شاکر نے اور نحو و صرف، امثال و اشعار اور بلاغت و عروض سے متعلق کتب سے محمود شاکر نے حسب ضرورت استفادہ کیا۔

محمود شاکر نے جس انداز میں تفسیر طبری کی تحقیق و تخریج کا کام کیا وہ ہر ایک کے لیے
نمونہ ہے، کتاب میں جہاں کہیں بھی کوئی شعر طبری نے کسی اور شاعر کی طرف منسوب کر دیا ہے،
محمود شاکر کی تیز نگاہ نے اس کا پتہ لگالیا، پھر انہوں نے اس کی تحقیق و توضیح اور تصحیح کی، اس طرح
کے اشعار کی تخریج میں انہیں جو دشواریاں پیش آئی ہوں گی، ان کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا
ہے جو کبھی تحقیق کی راہ کا راہی رہا ہو، ان اشعار کی تحقیق میں انہوں نے جو حوالے دیے ہیں ان
سے ان کے علم کی وسعت اور محنت و کاوش کا اندازہ ہوتا ہے، اشعار کے علاوہ آیات کی تفسیر میں
بھی بعض مقامات پر طبری سے لغزشیں ہوئی ہیں، محمود شاکر نے ان کا بھی انتہائی عالمانہ، مجتہدانہ
اور محققانہ انداز میں استدراک کیا ہے، تحقیق و تخریج کی منزل سے گزرنے کے بعد تفسیر طبری کی
کتابت و طباعت کا مرحلہ آیا، اس مرحلے میں بھی محمود شاکر نے جس توجہ اور انہماک سے اس کی
نگرانی کی وہ قابل دید ہے، اس تفسیر کی پہلی اور دوسری جلد کی طباعت کے بعد ان کے بڑے
بھائی احمد شاکر کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے امثال و اشعار وغیرہ کی تخریج کے ساتھ ساتھ
احادیث کی تخریج کا کام بھی ان کے سر آپڑا، بعد کی جلدوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ
زبان و ادب اور علوم قرآن کے مسائل اور مباحث کی طرح حدیث اور اصول حدیث کے امور پر
بھی ان کی گہری نظر تھی، اسی لیے اس اعتبار سے کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

تفسیر طبری جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی سترہ جلدیں عرصہ ہوا چھپ کر آگئی ہیں،
اس کے بعد کی جلدوں کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں، اس کا امکان ہے کہ یہ کام نامکمل رہ گیا
ہو، کیوں کہ اس کے محقق محمود شاکر گزشتہ سال علم و ادب کی خدمت کرتے ہوئے اس دار فانی سے
رخصت ہو کر اپنے آقا سے جا ملے ہیں۔

اس تفسیر کی تحقیق، تخریج اور تصحیح کے ساتھ ساتھ اس میں جو سب سے عظیم الشان کام
انجام پایا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی ہر جلد میں اشخاص، اشعار، امثال، الفاظ، احادیث اور اقوال
صحابہ کی مکمل فہرست موجود ہے، اس فہرست کی تیاری میں جس نزاکت اور نفاست کا مظاہرہ اس
کے لائق و فائق محقق نے کیا ہے، وہ علمی دنیا کے لیے انتہائی گراں قدر تحفہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیائے عرب میں کوئی شخص پیدا کرے جو بعد کی جلدوں کو اسی

انداز میں محنت کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے، تاکہ تفسیر طبری سے فائدہ اٹھانے والے اس
سے فائدہ اٹھائیں۔

اگر ہم محمود شاکر کے علمی سفر کا تجزیہ کریں تو انہیں تین مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ان
میں سے ہر مرحلے کی بڑی اہمیت ہے، پہلا مرحلہ اس زبان کا پوری یکسوئی اور محنت سے مطالعہ
ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا، یعنی نزول قرآن کے وقت کی وہ عربی زبان و ادب اور شاعری
جو پورے جزیرۃ العرب میں پھیلی ہوئی تھی، یہ زبان مختلف اسباب کے تحت اپنے ظاہر و باطن ہر
اعتبار سے عروج و کمال حاصل کر چکی تھی، بلکہ یہ کہا جائے کہ اس کے الفاظ میں اتنی معنویت اور
وسعت پیدا ہو چکی تھی اور اس کے جملوں اور تراکیب میں اتنی جامعیت اور تنوع پیدا ہو چکا تھا کہ یہ
آسانی سے ہر فکر، ہر خیال اور ہر موضوع کی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی تھی، حسن اتفاق سے اس
زبان کے بولنے والوں کو اپنی زبان سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی اور وہ اس کی ترقی اور
اشاعت کو اپنی زندگی کا سب سے مقدس فریضہ تصور کرتے تھے، اسی زبان کو بعد میں ادب جاہلی اور
شعر جاہلی سے تعبیر کیا گیا، محمود شاکر نے اس زبان کے نئے انداز و اسلوب سے مطالعہ کو اپنی زندگی
کا مشن بنالیا تھا، چنانچہ انہوں نے پورے دس سال تک انتہائی لگن اور توجہ سے اسے پڑھا، اس
زمانے میں جتنے ادبا اور شعرا کے دواوین یا ادبی شہ پارے خواہ وہ مطبوعہ شکل میں ہوں یا غیر مطبوعہ
شکل میں، ان سب کو تلاش کیا اور ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، حتی کہ تاریخ اور تراجم کی وہ کتابیں
بھی پڑھیں جن میں شعرا اور ادبا کا ضمناً تذکرہ موجود تھا، ہم سب اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ
قدیم عربی زبان و ادب کے زیادہ تر شعرا کے کلام، راویوں کی جد و جہد اور مساعی کی بدولت
مرتب ہوئے تھے، زبانی روایتوں میں مختلف اسباب کی بنا پر اشعار کی صحت کے حوالے سے مختلف
قسم کی خامیوں اور کمیوں کی موجودگی کا امکان رہتا ہے، ان میں حذف و اضافہ اور تقدیم و تاخیر کی
بھی پوری گنجائش ہوتی ہے، کبھی کبھی یہ تقصیرات اور حذف و اضافے کلام کے پورے حسن و جمال
کو متاثر کر دیتے ہیں، محمود شاکر نے اپنے ذوق اور اپنی محنت سے کام لے کر ان میں ایک ترتیب
قائم کرنے کی کوشش کی، بعد میں جب انہوں نے ان شعرا کے دواوین کی تدوین کا ارادہ کیا تو
انہیں اپنے ابتدائی زمانے کی محنت اور ریاضت سے بڑی مدد ملی، ادب جاہلی اور شعر جاہلی کے

ایک طویل زمانے تک مطالعہ کرنے اور اس میں اپنے آپ کو بالکل مصروف کر لینے کے نتیجے میں ان کے اندر ایک مخصوص قسم کا ذوق اور ملکہ پیدا ہوگیا تھا، جس کے باعث وہ اپنے اندر نادر اور اچھوتے خیالات اور کیفیات کے ابھرنے اور بڑھنے کا احساس و ادراک کر رہے تھے، اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"طویل سفر اور مشقت کے بعد اب میرا حال یہ ہوگیا ہے کہ میں جب جاہلی شاعری کو پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہر شعر بلکہ ہر لفظ میں ایک دنیا چھپی ہوئی ہے اور جب میں جاہلی دور کی شاعری کا بعد کے ادوار کی شاعری سے موازنہ کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دو الگ الگ دنیا ہیں، جس کیفیت سے میں جاہلی دور کی شاعری کے مطالعہ سے دوچار ہوا کرتا تھا، اسے میں بیان نہیں کر سکتا ہوں بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے قلب و وجدان میں پیدا ہونے والی کیفیت کبھی کبھی میرے ظاہری حواس سے بھی نمایاں ہونے لگتی تھی، چنانچہ میری نگاہیں اس کی چمک کو، میرے کان اس کے نغمے کو، یہاں تک کہ میری ناک اس کی مہک کو محسوس کرتی تھی، جس کیفیت سے میں دوچار ہوا ہوں اس پر شاید پڑھنے والا اور سننے والا یقین نہ کرے لیکن یہ اپنی کہانی ہے، اس میں درمیان کا کوئی راوی نہیں ہے"۔

جاہلی شاعری کے تفصیلی مطالعہ کے بعد وہ قرآن مجید کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئے تو وہ ایک دوسری کیفیت سے دوچار ہوئے، انہوں نے دیکھا کہ ایک ہی زمانے کے دو کلام جن کی زبان، تراکیب، محاورے، امثال اور تشبیہات سب کچھ ایک تھیں لیکن ان ہی الفاظ، تراکیب، محاورے، امثال اور تشبیہات کو استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا کلام پیش کر دیا جس کی اثر انگیزی اور سحر آفرینی کا ادب جاہلی سے کوئی مقابلہ نہیں، کتاب اللہ کی تراکیب اور الفاظ میں جو آواز، چمک، مہک، سوز اور کشش پائی جاتی ہے وہ بالکل مختلف ہے، اس طرح انہیں لگا کہ دو دنیا بالکل الگ الگ ہے، ایک دنیا ادب جاہلی کی ہے اور دوسری دنیا قرآن مجید کی ہے، چنانچہ جو لوگ نزول قرآن کے وقت موجود تھے وہ بہت زیادہ لکھے پڑھے نہیں تھے، ان کی نظر نہ یونانی

فلسفے پر تھی نہ ہندوستانی علوم پر تھی، وہ نہ تو رومن لا سے واقف تھے اور نہ ہی ایرانی و رومی نظام حکومت کی تفصیلات سے آگاہ تھے، وہ صرف زبان کے شیدائی تھے، ان لوگوں کے سامنے جب قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی تھی تو وہ حیران و ششدر ہو جاتے تھے اور ان پر سراسیمگی اور دہشت طاری ہو جاتی تھی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ یا تو انہیں کچھ ہوگیا ہے یا حضرت محمد ﷺ کو جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ربوبیت کی دعوت دے رہے ہیں اور اس کے لیے قرآنی آیات کی تلاوت کر رہے ہیں، یہ آیات جس زبان میں تھیں اس کی رعنائی، شگفتگی، فصاحت، بلاغت، عبقریت اور جامعیت سے وہ واقف تھے لیکن قرآنی آیات کی اثر انگیزی اور سحر آفرینی کا معاملہ عجیب و غریب تھا، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ بقول کسے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ایک طرف وہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو دیکھتے تھے، دوسری طرف وہ نبی کریم ﷺ کی طرف دیکھتے تھے، یہ نبی ان کے لیے اجنبی نہیں تھے، وہ ان کے ظاہر و باطن سے واقف تھے، ان کی شکل و صورت، اخلاق و کردار اور ہوش و حواس کے بارے میں انہیں اطمینان بخش باتیں معلوم تھیں، اس لیے وہ جب ان کے سامنے کلام الٰہی کی تلاوت کرتے تھے تو وہ اسے جھٹلانے کی تاب نہیں لاتے تھے، وہ یہ صاف محسوس کر رہے تھے کہ اس قرآن کی وجہ سے ان کے گھر اور خاندان میں افتراق و انتشار برپا تھا، چنانچہ ان کے بچے اپنے باپ سے، بیویاں اپنے شوہر سے، غلام اپنے آقا سے اور بہن اپنے بھائی سے بغاوت اور مخالفت پر آمادہ تھے، الغرض انتہائی شدید قسم کی کشمکش اور تناؤ تھا، کفار مکہ نے اس سے عاجز آکر اس سے نبرد آزمائی کا یہ نسخہ تجویز کیا کہ تلاوت آیات کلام الٰہی کے موقع پر شور و غوغا برپا کیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ.

علامہ محمود شاکر نے مالک بن نبی کی کتاب "الظاهرة القرآنية" کے مقدمہ میں مذکورہ بالا صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور موزونیت و معقولیت کی بہ دولت جب اس کی تاثیر اور کشش کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا تو اس سے

پریشان ہو کر کفار مکہ ایک دن ایک جگہ جمع ہوئے اور اس امر پر غور وفکر کیا کہ کون سی ترکیب، کون سی تجویز یا کون سا اقدام کیا جائے جس کے ذریعہ نبوت کا دعوا کرنے والے محمد ﷺ اور ان پر نازل ہونے والی کتاب ''قرآن مجید'' سے متعلق متعین صورت میں کوئی ایسی بات کہہ دی جائے اور اسے عوام میں پھیلا دیا جائے جس سے قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کی بڑھتی مقبولیت کو روکا جاسکے، چنانچہ کسی نے آپ ﷺ کو (نعوذ باللہ) ساحر کہنے کی، کسی نے مجنوں کہنے کی، کسی نے یہودیوں سے سیکھنے کی، کسی نے باپ دادا کے دین پر حملہ آور ہونے اور کسی نے گھر اور خاندان کے پرسکون ماحول کو تباہ وبرباد کرنے کے الزام لگائے جانے کی تجویز پیش کی، یہ سب سن کر ان کے ایک قبیلے کے سردار ولید بن مغیرہ نے کہا کہ میں ایک ایسی بات کہنے جارہا ہوں جس سے جامع کوئی اور بات نہیں ہوسکتی، وہ یہ ہے کہ محمد ﷺ ایک ایسے جادوگر ہیں جس کے کلام میں ایک ایسی تاثیر ہے جس کے باعث بھائی بھائی سے، باپ بیٹے سے اور شوہر بیوی سے جدائی اختیار کرلیتا ہے، ہم اگر اس بات کو لوگوں میں پھیلائیں گے تو امکان ہے کہ قرآن مجید کے اثرات کو روکا جاسکتا ہے''۔

محمود شاکر نے مزید لکھا ہے کہ کفار ومشرکین کی تمام تر مخالفتوں اور سازشوں کے باوجود صالح اور سلیم الطبع افراد مسلسل قرآن مجید کی دعوت پر لبیک کہہ رہے تھے اور دن بہ دن اس سے ان کے عشق وشیفتگی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، وہ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے، سوتے، جاگتے، ہر وقت قرآنی آیات کو پڑھتے اور گنگناتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قرآن مجید کے الفاظ اور تراکیب کی حلاوت اور شیرینی ان کی رگ وپے میں رچ بس گئی تھی اور وہ اسی کے سہارے زندہ ہیں، محمود شاکر نے اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا وہ واقعہ نقل کیا ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

''حضرت ابوبکرؓ مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کے سفر پر تھے، راستے میں ان کی ملاقات ابن دغنہ سے ہوگئی، انہوں نے پوچھا ''آپ کہاں جارہے ہیں''، کہنے لگے ''مکہ چھوڑ کر ایک ایسی جگہ جارہا ہوں جہاں آزادی سے اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرسکوں''، ابن دغنہ نے کہا ''آپ کو مکہ سے کون نکال سکتا ہے، آپ غریبوں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں اور ان کی غم گساری کرتے ہیں، آپ اپنے گھر واپس چلیں، میں آپ کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا

ہوں''، مکہ آکر انہوں نے اعلان کردیا کہ ''ابوبکر میری حفاظت میں ہیں، اب کوئی ان سے تعرض نہ کرے''، مکہ والوں نے ان سے کہا ''ہم آپ کی بات تسلیم کرتے ہیں لیکن آپ سے ایک گزارش یہ ہے کہ آپ ابوبکر سے کہیں کہ جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کریں تو اپنے گھر کے اندر کریں، کیوں کہ جب وہ قرآن پاک تیز آواز سے پڑھتے ہیں تو ہمارے بیوی بچے گمراہ ہوجاتے ہیں''، چنانچہ ابن دغنہ نے ابوبکر سے درخواست کی کہ وہ ان کی بات مان لیں، انہوں نے کہا، ٹھیک ہے، اس کے بعد دو چار روز تک انہوں نے اپنے گھر میں مدھم آواز میں تلاوت کی لیکن یہ چند روز ان کے لیے پہاڑ بن گئے، وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا کیوں کہ قرآن مجید کی تلاوت سے انہیں جو کیف وسرور حاصل ہوتا تھا، اس سے ان کے دل ودماغ کے ساتھ ساتھ ان کے کان اور زبان بھی محظوظ اور سیراب ہوتے تھے، چنانچہ ایک دن وہ اپنے گھر سے باہر نکل آئے اور حسب سابق بہ آواز بلند قرآن مجید کی تلاوت شروع کردی، مکہ کے لوگوں نے ابن دغنہ سے شکایت کی کہ ابوبکر نے جو عہد کیا تھا وہ عہد توڑ دیا، وہ ان کے پاس آئے اور بدعہدی کا سبب دریافت کیا، اس پر انہوں نے برجستہ کہا ''تم اپنی امان واپس لے لو، اپنی ذمہ داری ختم کرلو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو''۔

گویا حضرت ابوبکر کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی نعمت قرآن پاک کی تلاوت اور اس سے ہونے والی حلاوت تھی، اس کے سامنے دنیا کی ہر نعمت ہیچ اور حقیر تھی یہی معاملہ دیگر صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالی اجمعین) کا تھا قرآن مجید کی اس عجیب وغریب تاثیر اور جاذبیت کی خود رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ بھی گواہ اور شاہد ہے آپ ﷺ کی پیدائش مکہ میں ہوئی آپ اپنے زمانہ کی روایات اور زبان وبیان کے رموز واسرار سے واقف تھے انہیں اظہار مافی الضمیر پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، لیکن جب غار حرا میں حضرت جبریل ان کے پاس تشریف لائے اور پڑھنے کے لئے کہا تو آپ نے برجستہ جواب دیا کہ ''میں پڑھا لکھا نہیں ہوں'' حضرت جبریلؑ نے جب دوبارہ پڑھنے کے لیے کہا اور سورہ علق کی چند ابتدائی آیات تلاوت کی تو نبی کریم ﷺ اس کی تاب نہیں لاسکے، ان پر ہول طاری ہوگیا، وہ کانپنے لگے، گھر آئے تو خوف اور دہشت کی وجہ سے وہ کانپ رہے تھے، حضرت خدیجہؓ سے کہا ''زملونی'' مجھے چادر اڑھا دو۔ چادر اڑھا دو قابل غور بات یہ ہے

کہ قرآن مجید کی زبان عربی تھی اور آپ عربی زبان کے جوہر شناس تھے پھر یہ خوف سراسیمگی، دہشت اور کپکپی کیوں تھی؟ یہ دراصل قرآن مجید کا اعجاز تھا اور اس کے الفاظ اور تراکیب کی تاثیر اور کشش تھی یہی وہ مقام ہے جہاں بے ساختہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورہ بلکہ اس کی ہر آیت اور ہر لفظ اس زمانے کی زبان سے بالکل مختلف اور ممتاز ہے جس زمانے میں اس کا نزول ہوا تھا اور یہی فی الواقع قرآن کا اعجاز ہے۔

محمود شاکر کے علمی سفر کا دوسرا مرحلہ تصنیف و تالیف اور تحقیق و تخریج سے شروع ہوتا ہے اس سلسلے میں ان کی پہلی کتاب "حیات متنبی من شعرہ" منظر عام پر آئی اس کتاب کا علمی و ادبی حلقوں میں انتہائی پرتپاک خیر مقدم کیا گیا، انہوں نے تحقیق و تخریج کے معیار کو اعلا سے اعلا بناتے ہوئے اس کے اسلوب و اسٹائل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اس میں زبان و بیان کی حلاوت کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور اور ادراک بھی کارفرما ہے اسی وجہ سے یہ کتاب بیسویں صدی کی علمی و ادبی شاہکار تصور کی جاتی ہے اس کتاب کے بعد انہوں نے "طبقات فحول الشعرا لابن سلام الجمحی" کی تحقیق و تدوین کا کام شروع کیا حسب سابق انہوں نے اس کتاب کی تحقیق میں جو محنت اور کاوش کی اور الفاظ و تراکیب کی صحیح ترتیب میں شعرفہمی کے جس ذوق کا ثبوت دیا اس کی وجہ سے یہ امر واقعہ ہے کہ عربی فن تحقیق و تخریج جامد شکل کے بجائے ایک زندہ اور فعال مضمون کی صورت اختیار کر گیا، ظاہر ہے اس کام کی تکمیل کے لیے متعلقہ ادوار کے شعرائی زندگی، ان کے ادبی و فنی شہ پاروں کی حیثیت اور اپنے معاصرین میں ان کے ادبی مقام و مرتبہ کا صحیح ادراک و شعور ناگزیر تھا، اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ تحقیقی عمل کے کارگزار کی نگاہ جتنی وسیع ہوگی اور اس کا ذوق جتنا فعال ہوگا، اسی کے بہ قدر اس کے نتائج تحقیق تشفی بخش اور جاذب نظر ہوں گے، چنانچہ محمود شاکر کی مذکور کتاب کے مطالعہ کے بعد بے ساختہ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور یہ کہ انہوں نے مطالعہ کے دوران مفید باتیں نوٹ کرلی تھیں اور بعد میں اپنی ذہانت اور اپنے شعری شعور سے کام لے کر اپنی یادداشتوں کو انتہائی مناسب انداز میں مرتب کردیا تھا، یہی وجہ ہے کہ "طبقات فحول الشعرا" کے بعد محمود شاکر نے علم و تحقیق کی دنیا میں اپنا نام روشن کیا اور تمام عرب محققین نے اسے فن تحقیق کا شاہکار قرار دیا، اس کتاب کے بعد انہوں نے "نسب قریش لابن بکار"

کی تحقیق و تدوین کا آغاز کیا، اس کتاب کی اس حیثیت سے بہت اہمیت ہے کہ اس میں اس کے مصنف نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی مدنی زندگی کا جس انداز میں تعارف کرایا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں آپس میں کس قدر میل و محبت تھی، ہر ایک دوسرے کا کس قدر احترام و اکرام کرتا تھا، ان کے درمیان باہم رواداری، تحمل اور برداشت کا وصف نمایاں طور سے موجود تھا، وہ ایک دوسرے کے یہاں شادیاں کرتے تھے اور ان کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتے تھے، اس کتاب میں ابتدائی اسلامی دور کے افراد کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی تصویر بھی ملتی ہے، اس طرح یہ کتاب اس دور کی سیاست اور سماج سے واقفیت کا بھی ایک بنیادی ماخذ ہے اور پہلی صدی ہجری کے ایک مورخ، سیرت نگار اور محقق کے لیے بہت ہی اہم سوغات ہے، محمود شاکر نے اس کتاب کی تحقیق و تدوین میں جس عرق ریزی اور باریک بینی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے ان کی عقیدت و محبت کا ثبوت ملتا ہے اور اسلامی تاریخ سے ان کے شغف اور انہماک کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرا مرحلہ تفسیر طبری کی تحقیق اور تخریج کا ہے، محمود شاکر نے یہ کام کس محنت اور توجہ سے انجام دیا ہے، اس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، ہم یہاں ان نئے افکار و خیالات کی طرف اشارہ کریں گے جن کا اظہار انہوں نے دوران تحقیق و تخریج کیا ہے یا جن کا تذکرہ ان مقالات و مضامین میں آیا جو انہوں نے بعد میں قرآنیات سے متعلق سپرد قلم کیے ہیں، یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید اور اس کے مختلف علوم و فنون میں ان کے علمی شغف اور تحقیقی کاوشوں کا آغاز تفسیر طبری کی تحقیق و تخریج کا کام اپنے ذمہ لے لینے کے بعد ہوا، یوں تو یہ بات تمام علوم و فنون کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ ان میں غور و فکر اور تحقیق و تفتیش سے نئی راہیں اور جہتیں سامنے آتی ہیں لیکن خاص طور سے قرآن مجید کا معاملہ بالکل منفرد ہے اور یہ دراصل اس کا ایک کھلا ہوا اعجاز ہے، قرآن مجید نے خود اس بات کا اعلان کر رکھا ہے کہ جو شخص بھی اس سے لگاؤ، شغف اور انہماک کا مظاہرہ کرے گا وہ اس کے لیے اپنے علم اور معرفت کے دروازے کھول دے گا، اس کی ہر آیت میں ایک دنیا نظر آئے گی، بلکہ اس کے اسرار و رموز اور تجلیات کے سامنے اسے ساری کائنات اور اس کی وسعتیں تنگ و تاریک نظر آئیں گی، قرآن مجید نے اپنی

آیات کے معانی اور مفاہیم کے فہم و ادراک کے لیے '' تقویٰ '' کا وصف ضروری قرار دیا ہے اور تقویٰ کے ثبوت کے لیے ایمان بالغیب، اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ جیسے اقدامات لازم اور ناگزیر قرار دیے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ . الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ . (البقرہ:۱-۳)	(الف - لام - میم یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔)

قرآن مجید پر غور و فکر کے دوران استاذ محمود شاکر کے ذہن و دماغ میں جو نادر اور اچھوتے خیالات آتے تھے، انہیں وہ کبھی اپنے شاگردوں کی علمی مجالس میں ظاہر کر کے ان پر بحث و مباحثہ کراتے تھے اور کبھی انہیں قلم بند کر کے علمی و تحقیقی جرائد اور مجلات میں شائع کراتے تھے، ان کے مطبوعہ مقالات میں مشہور افریقی ثم فرانسیسی ادیب اور محقق مالک بن نبی کی کتاب '' الظاہرۃ القرآنیۃ '' پر ان کا مبسوط اور وقیع مقدمہ ہے جو پچاس صفحات پر مشتمل ہے، یہ مقدمہ اپنی وسعت اور جامعیت کے لحاظ سے ایک ضخیم کتاب کے مساوی ہے، اس کے مطالعہ سے جو پہلی چیز سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ پورے قرآن مجید کو ایک وحدت تصور کرتے تھے، بہ ظاہر تیس پاروں اور مختلف اور متنوع آیات پر مشتمل قرآن کے بارے میں یہ تاثر سامنے آتا ہے کہ یہ الگ الگ موضوعات کو پیش کرنے والے ایسے پیراگراف ہیں جن کا باہمی ربط و تعلق مفقود اور معدوم ہے لیکن متقدمین میں اور عصر حاضر میں بھی ایسے اصحاب علم گزرے ہیں جنہوں نے اس تاثر کی نفی کی ہے، ان میں سے ایک محمود شاکر بھی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ قرآنی سورتوں اور آیات کے مابین ربط و تعلق کے بارے میں جو شبہات اور اشکالات پیدا ہوتے ہیں، وہ فی الواقع قلت تدبر و تفکر کا نتیجہ ہوتے ہیں، ورنہ جو شخص بھی انہماک سے غور و فکر کرے گا اور پورے قرآن مجید کی بار بار تلاوت کرے گا تو اس کے سارے اشکالات خود بہ خود ختم ہو جائیں گے اور اسے پورا قرآن مربوط اور منظم نظر آئے گا، اس سلسلے میں انہوں نے ایک عمدہ بحث سورتوں اور آیات کے شان نزول کے

بارے میں کی ہے جو ہمیشہ ربط و تعلق اور نظم آیات و سور کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ تصور کیا جاتا رہا ہے، انہوں نے یہ صراحت کی ہے کہ مختلف سورتوں اور آیتوں کے شان نزول سے واقفیت کے باوجود یہ مناسب نہیں ہے کہ انہیں مخصوص افراد اور واقعات کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان میں مذکور احکام اور موعظت کی باتوں کو ہمیشہ اور رہتی دنیا تک کے لیے موجود اور باقی تصور کرنا چاہیے، اس ضمن میں انہوں نے واقعۂ افک، منافقین کے مختلف طرزہائے عمل، غزوۂ تبوک میں تین مخلص صحابہ کرام کی جہاد میں عدم شرکت اور قرآن مجید میں ان کے طرز عمل پر تبصرہ وغیرہ جیسے مقامات کا ذکر کیا ہے اور ان کے متعین اور مخصوص ہونے کے باوجود ان سے حاصل ہونے والے عمومی قسم کے احکام و معلومات کی وضاحت کی ہے۔

دوسری خاص بات جو اس مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید میں مذکور، مختلف معجزات کا ایک خاص انداز میں تجزیہ اور مطالعہ کیا ہے، معجزہ کا معنی ہے کوئی ایسا واقعہ جس کا صدور کسی انسان سے ممکن نہ ہو اور جس پر عقل انسانی حیران اور ششدر رہ جائے، محمود شاکر نے متعدد مثالوں سے یہ بات ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معجزات کے بیان کرنے میں دو مقاصد خاص طور سے پیش نظر رکھے ہیں: ۱- اپنی وحدانیت کا اثبات، ۲- اپنی قدرت اور قوت کا اظہار، ان کے افکار و خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام، جن سے معجزات صادر کرائے گئے ہیں، کے سامنے ان کی شرک اور بت پرست قوم ہوتی تھی جو نہ صرف شرک و بت پرستی میں مبتلا ہوتی تھی بلکہ مشرکانہ نظام کی بقا و استحکام اور اس کے فروغ کی بھی علم بردار ہوتی تھی، انبیا نے انہیں شرک و بت پرستی سے باز رہنے اور اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرنے کی دعوت دی، اس کے لیے انہوں نے جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات برحق اور اس کی صفات حسنہ کا جامع اور بلیغ انداز میں تعارف پیش کیا وہیں دوسری طرف شرک و بت پرستی کے نظام پر شدید تنقید کی اور اس کی بے وقعتی اور بے وزنی کو طشت از بام کیا۔

علامہ محمود شاکر نے اپنی مذکورہ فکر کی تائید و تصدیق میں جن انبیائے کرام کا نام لیا ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ اور حضرت ابن مریمؑ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے ان الفاظ میں:

یَا اَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ وَ لَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا (مریم:۴۲)

اے ابو جان! آپ کیوں اس چیز کی بندگی کرتے ہیں جو نہ سنتی ہے، نہ دیکھتی ہے اور نہ ہی آپ کو کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

شرک و بت پرستی کی واضح تردید اور اس کا ابطال ہے اور پھر بعد میں ان کی قوم کی ان سے ناراضگی اور خفگی اور بالآخران کا آگ میں ڈالا جانا اور اس سے ان کا صحیح وسالم نکل آنا، اللہ تعالیٰ کی قدرت، حاکیت اور تصرف کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، ارشاد الٰہی ہے:

یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ (الانبیا:۶۹)

ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی بن جا اور سلامتی بن ابراہیم پر۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے واقعہ میں ابتدا سے لے کر انتہا تک جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی حاکیت، اس کی قدرت، اس کے علم اور اس کی کارفرمائی و کارسازی کے انمٹ ثبوت ملتے ہیں اور پھر جیل کی زندگی میں ایک موقعہ پاتے ہی ان کا اپنے دو دوستوں سے یہ فرمانا کہ:

یَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (یوسف:۳۹)

اے زنداں کے ساتھیو! کیا بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔

اس امر کی دلیل ہے کہ وہ شرک کی تردید کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے، اسی طرح حضرت زکریاؑ کے یہاں یحییٰ کی ولادت اور حضرت مریم کے یہاں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت، پرورش اور بعد کی پوری زندگی حتی کہ ان کا "رفع الی السماء" سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور غلبہ و اقتدار پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں، قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی ان دونوں واقعات کا ذکر ہوا ہے ان میں اللہ کی حاکیت اور قوت کو سب سے نمایاں طور سے پیش کیا گیا ہے، سورۂ مریم میں ارشاد ہوا ہے:

یٰزَکَرِیَّا اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُہٗ یَحْیٰی، لَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتْ

اے زکریا ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا، ہم نے اس جیسا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا، عرض کیا،

امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا، قَالَ کَذٰلِکَ قَالَ رَبُّکَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَکُ شَیْئًا. (مریم:۷ تا ۹)

پروردگار! میرے یہاں کیسے بیٹا ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوکر سوکھ چکا ہوں، جواب ملا! ایسا ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے، آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تم کچھ نہ تھے۔

حضرت مریم اور عیسیٰ کے بارے میں خاص طور سے سورہ مریم کی آیات ۱۶ تا ۳۳ کی تلاوت اور مطالعہ کیجیے تو عجیب وغریب قسم کی سرشاری اور کیف ایمانی سے دوچار ہوں گے، ان آیات میں الفاظ کا جو حسین انتخاب ہے، جملوں میں جو اچھوتی تراکیب ہیں اور پیغام کی جو رفعت اور عظمت ہے، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی ہے، یقیناً یہ اعجاز، بلاغت اور فصاحت کی انتہا اور کمال پر پہنچی ہوئی تعبیرات ہیں، ان سے جہاں ایک طرف حضرت مریم کی پاک بازی اور ان کا تقوی اور خوف خداوندی کا اثبات ہوتا ہے تو دوسری طرف حضرت عیسیٰ کی تخلیق کے مخصوص انتظام کی صراحت ہوتی ہے اور تیسری طرف ان کی دعوت کے بنیادی نکات سے بھی واقفیت ہوتی ہے، اسی طرح ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حاکیت اور اس کی وحدانیت و ربوبیت کے واضح دلائل ملتے ہیں اور یہی دراصل حضرات انبیائے کرام کی دعوت کے بنیادی مقاصد ہیں۔

معجزات کے ضمن میں ایک اور بات جسے محمود شاکر نے نمایاں طور سے پیش کیا، وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جن انبیائے کرام کے واقعات یا معجزات مذکور ہیں، ان کا تذکرہ توریت اور انجیل میں بھی ہوا ہے لیکن چوں کہ یہ کتابیں مرور ایام کے ساتھ تحریف و تبدیلی سے دوچار ہوئی ہیں، اس لیے ان میں بیان کردہ انبیائے کرام کے احوال زندگی، ان کے ذریعہ پیش شدہ معجزات اور ان کی دعوت کے بنیادی نکات بھی حذف و اضافہ اور رد و بدل سے محفوظ نہیں رہ سکے، تحریف اور تبدیلی کے اس عمل کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس سے انبیائے کرام کی ذات گرامی اور ان کی عظمت و عزت کو بھی داغ دار کر دیا گیا ہے اور ان سب کی وجہ سے معجزات کی پیش کش کے بنیادی مقاصد اور ان کی حقیقی روح معدوم اور مجروح ہوگئی لیکن قرآن مجید نے ان

معجزات اور واقعات کو بیان کر کے ایک طرف ان کے وقوع اور صدور کی تصدیق کی ہے تو دوسری طرف ان میں کی گئی تحریف اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے حذف و اضافہ کو بھی نمایاں کر کے رکھ دیا ہے اور یہ سب کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ ان سے ان کی روح اور ان کے صدور کے وقت کی حقیقی صورت حال بھی واضح ہوگئی ہے، اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید نے ان کا تذکرہ کر کے انہیں دوسری زندگی عطا کردی ہے، اب ان واقعات کا قاری صرف ان کے وقوع پذیر ہونے کے زمانہ اور اشخاص سے نہیں بلکہ ان میں پنہاں ان حقائق اور پیغام سے بھی واقف ہوتا ہے جو دیگر کتب مقدسہ میں تقریباً دھندلے پڑ گئے تھے۔

ایک اور نکتہ جسے محمود شاکر نے معجزات پر گفتگو کے دوران ابھارا ہے، یہ ہے کہ جن افراد اور گروہوں نے ماضی میں قرآن کے اندر مذکور معجزات کا انکار کیا ہے اور جو لوگ موجودہ زمانے میں بھی ایسا کرنے کی جرأت کرتے ہیں، ان کی اکثریت کے مرجع اور سرچشمہ یہود و نصاریٰ ہیں، ان کی نظر میں یہ عجیب و غریب معاملہ ہے کہ وہ لوگ جن کے مذاہب کی ساری بنیاد معجزات پر ہے اور جن تک دینی امور کی تمام تفصیلات معجزات کے ذریعہ پہنچ سکی ہے، وہ حضرات قرآن مجید کے اندر مذکور معجزات اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت طیبہ پر انگشت نمائی اور نقد و تعریض کرتے ہیں، حالاں کہ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کا تعلق ہے انہوں نے اپنی پوری حیات طیبہ میں کوئی ایسا معجزہ پیش نہیں کیا جس نے آپ ” کی دعوت کو حیرت انگیز مقبولیت عطا کی ہو، بلکہ آپ کی پاکیزہ زندگی، راہ خدا میں آپؐ کی جد و جہد، آپ کا ایثار و تقویٰ، آپؐ کی نصح و خیر خواہی وغیرہ اور خود آپؐ کے ذریعہ پیش ہونے والا کلام الٰہی، یہ وہ ذرائع و وسائل ہیں جو آپؐ کی دعوت کے فروغ و استحکام میں معاون اور مددگار ثابت ہوئے، یقیناً اور لاریب آپ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے جس کی ہر آیت معجزہ ہے اور جو ظاہری اور معنوی ہر لحاظ سے ہمیشہ باقی رہے گا، قُل لَئِنِ اجتَمَعَتِ الإنسُ وَالجِنُّ عَلىٰ أَن يَأتوا بِمِثلِ هٰذَا القُرآنِ لا يَأتونَ بِمِثلِهِ وَلَو كانَ بَعضُهُم لِبَعضٍ ظَهيرًا (الاسراء:۸۸)۔

....

اسلام اور تعلیم نسواں

از:- ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

عموماً علم کی خدمت و اشاعت اور تعلیم، افتاء و ارشاد مردوں ہی کا کام سمجھا جاتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام ہی کی روایتیں، فتوے اور ارشادات کا ذخیرہ ہمارے پاس ہوتا جب کہ صحابیات خصوصاً حضرت عائشہؓ سے بھی کثرت سے حدیثیں مروی ہیں اور ان کے فتوے اور ارشادات بھی منقول ہیں۔

حضرت عائشہؓ کا مسکن ہمیشہ ایک علمی مرکز اور درس گاہ بنا رہا، عورتیں اور جن مردوں کا پردہ حضرت عائشہؓ سے نہیں تھا وہ ان کے حجرہ کے اندر آ کر مجلس میں بیٹھتے اور دوسرے لوگ حجرہ کے سامنے مسجد نبوی میں بیٹھتے اور دروازے پر پردہ پڑا رہتا، اس کی اوٹ میں وہ خود رونق افروز ہوتیں۔(۱)

طریقۂ درس یہ تھا کہ لوگ سوالات کرتے اور یہ جواب دیتیں، کبھی کوئی سلسلۂ بحث چھڑتا اور استاد و شاگرد اس خاص موضوع پر گفتگو کرتے (۲)، کبھی خود کسی مسئلہ کو چھیڑ کر بیان کرتیں اور لوگ خاموشی کے ساتھ سنتے، اپنے شاگردوں کی زبان، طرز ادا اور صحت تلفظ کی بھی سخت نگرانی کرتیں، ایک دفعہ ایک صاحب کی زبان صاف نہ تھی، اعراب میں غلطیاں کرتے تھے، حضرت عائشہؓ نے ان کو ٹوکا۔(۳)

ان عارضی طالب علموں کے علاوہ جو کبھی کبھی حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے، وہ مختلف خاندانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں اور شہر کے یتیم بچوں کو اپنی آغوش تربیت میں لیتی تھیں اور ان کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دیتی تھیں، غیر لڑکوں کو جو گو بڑے ہو چکے ہوں، اپنی بہنوں یا

(۱) مسند احمد، ج ۶، ص ۷۲ و ابن سعد، جز ثانی، قسم ثانی، ص ۲۹ بحوالہ سیرت عائشہ، ص ۲۶۹ (۲) مسند احمد، ج ۶، ص ۷۵ (۳) صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب کراہیۃ الصلوٰۃ بحضرۃ الطعام، ص ۲۰۹، مطبوعہ مصر۔

بھانجیوں سے دودھ پلواتی تھیں اور خود ان کی رضاعی خالہ یا نانی بن کر ان کو اندر آنے کی اجازت دیتی تھیں (۱)، یہ حضرت عائشہؓ کی منفرد رائے تھی، جمہور کا یہ مسلک نہیں، جن لوگوں کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی اور وہ غیر محرم تھے، وہ افسوس کرتے تھے کہ ہم کو حصول علم کا اچھی طرح موقع نہیں ملتا تھا۔ (۲)

حضرت عائشہ ہر سال حج کو تشریف لے جاتیں، کوہ حرا اور کوہ ثبیر کے درمیان ان کا خیمہ نصب ہوتا تھا، جہاں تشنگان علم جوق در جوق دور دراز ممالک سے آکر حلقۂ درس میں شریک ہوتے (۳)، لوگ مسائل دریافت کرتے، اپنے شکوک وشبہات کا ازالہ چاہتے اگر بعض لوگ مسائل پوچھنے میں جھجکتے تو وہ ڈھارس بندھاتیں، ایک صاحب ایک بات پوچھنے میں شرمارہے تھے تو فرمایا "جو تم اپنی ماں سے پوچھ سکتے ہو وہ مجھ سے بھی پوچھ سکتے ہو" (۴)، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی تعلیم وتربیت مادرانہ شفقت سے کرتی تھیں، بچوں کو متبنیٰ بنا کر تعلیم دیتیں، ان کے مصارف اپنے ذمے لے لیتیں، شاگردوں کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت اچھا تھا، ان کے شاگرد بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے، ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تھی جن میں مردوں کے ساتھ بڑی تعداد عورتوں کی تھی، رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہت سی صحابیات اپنی معروضات ان کے واسطے سے آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کراتی تھیں اور حضرت عائشہؓ جہاں تک ہوتا ان کی ترجمانی اور وکالت کرتیں۔ (۵)

حضرت عائشہؓ کو جو مرجعیت حاصل تھی، اس کی بنا پر ہر مشکل مسئلہ میں لوگ ان کے آستانے کی طرف رجوع کرتے تھے، اپنے والد اور حضرت عمرؓ وعثمانؓ کے زمانے میں وہ منصب افتا پر فائز تھیں (۶) اور اکابر صحابہ کی موجودگی میں وہ فتوے دیتی تھیں، حضرت عمرؓ وعثمانؓ ان سے سنن و آداب معلوم کراتے تھے (۷)، حضرت امیر معاویہؓ شام سے قاصد بھیج کر ان سے مسائل دریافت کراتے (۸)، ممالک اسلامیہ سے لوگ مدینہ کی زیارت کے لیے آتے تو وہ پردے کے

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاعۃ باب رضاعۃ الکبیر و مسند احمد، ج ۶ ص ۲۷۱ (۲) سیرت عائشہ ص ۲۷۰، طبع یازدہم ۲۰۰۳ء (۳) ابن سعد جز ۸، محدثین ص ۲۱۸ و ۲۱۹ بحوالہ سیرت عائشہ ص ۲۷۰ (۴) مسند احمد، ج ۶ ص ۶۵ (۵) ایضاً ص ۲۲۶ (۶) ابن سعد جز ۲، قسم ۲ ص ۱۲۶ (۷) ایضاً (۸) سیرت عائشہ ص ۲۷۶۔

پیچھے سے مختلف مسائل اور شکوک وشبہات پیش کرتے اور جوابات سن کر تسلی پاتے (۱)، موسم حج میں سائلوں اور مستفتیوں کا ہجوم ان کے خیمہ کے پاس ہوتا تھا، جن مسائل میں صحابہ کا اختلاف ہوتا ان میں ان کو حکم مانتے تھے (۲) ان کے فتوے اکٹھا کیے جائیں تو ضخیم جلدوں میں آئیں گے، اسی طرح وہ وعظ وارشاد کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں، جب بھی کوئی غلط کام دیکھتیں اس کی اصلاح کی فکر کرتیں (۳)، ان کے وعظ وارشاد کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے پاتا تھا۔

دینی، علمی اور تعلیمی خدمات کی طرح حضرت عائشہ نے اجتماعی وسیاسی امور میں بھی حصہ لیا، جنگ جمل میں فوجی رہبری فرمائی، مسلمان عورتوں کا مجمع ہوتا تو امامت بھی کرتیں، انہوں نے بعض غزوات بدر، احد اور خندق میں بھی شرکت کی اور جنگ احد میں پائینچے چڑھائے مشک کاندھے پر لیے زخمیوں کو دوڑ دوڑ کر پانی پلا رہی تھیں، ان کے ساتھ بعض اور خواتین بھی یہ کام انجام دے رہی تھیں (۴)، غزوۂ خندق میں وہ زنانہ قلعہ سے نکل کر جنگ کی حالت دیکھتیں تھیں۔ (۵)

غرض حضرت عائشہؓ کی زندگی سے عورتوں کو بڑی رہنمائی ملتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پردے میں رہ کر علمی، مذہبی، اجتماعی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں اور پند وموعظت، اصلاح وارشاد اور امت کی بھلائی کے کام بجا لاسکتی ہیں، اسلام نے عورتوں کو جو عزت وکرامت اور شرف ورتبہ بخشا ہے، حضرت عائشہؓ کی زندگی اس کی عملی تفسیر ہے۔

حضرت عائشہؓ کے علاوہ جو دوسری صحابیات علمی حیثیت سے ممتاز تھیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ: حدیث وفقہ اور دوسرے علوم میں حضرت عائشہؓ کے بعد ان کا پایہ سب میں بلند تھا، انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے براہ راست بھی حدیثیں بیان کی ہیں اور اپنے پہلے شوہر ابو سلمہؓ اور حضرت فاطمہؓ وغیرہ کے واسطہ سے بھی روایتیں کی ہیں اور خود ان سے روایت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔

(۱) مسند احمد، ج ۶ ص ۱۲۶ و ۲۱۹ و صحیح بخاری کتاب المناسک، باب طواف النساء مع الرجال، ج ۱ ص ۲۱۹، کرزن پریس دہلی، ۱۳۲۲ھ (۲) سیرت عائشہ ص ۲۸۲ (۳) ایضاً ص ۲۸۷، ۲۸۸ (۴) صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ احد، ج ۲ ص ۵۷۶، کرزن پریس، ۱۳۲۵ھ (۵) مسند احمد، ج ۶ ص ۱۴۱

ام المومنین حضرت حفصہؓ: علم و فضل میں ممتاز تھیں، ان سے بہ کثرت حدیثیں مروی ہیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اور اپنے والد حضرت فاروق اعظمؓ سے روایتیں کی ہیں اور ان سے کئی حضرات نے روایتیں کی ہیں۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ: نے رسول کریم ﷺ اور زینب بنت جحشؓ کے واسطہ سے روایتیں کی ہیں اور ان سے ان کے بھائی حضرت معاویہؓ اور عتبہ بن ابوسفیانؓ اور عروہ بن زبیرؓ نے احادیث کی روایت کی ہے۔

ام المومنین حضرت میمونہؓ: کی بھی حدیثیں مروی ہیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ سب ازواج میں زیادہ متقی اور صلہ رحمی کرنے والی تھیں۔

ام المومنین حضرت جویریہؓ: نے آنحضرت ﷺ سے حدیثیں روایت کی ہیں اور ان سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور مجاہد بن جبیرؓ نے روایت کی ہے۔

یہ ان امہات المومنین کا ذکر تھا جو فقہ و فتاوی میں خاص شہرت رکھتی تھیں، ان کے علاوہ حضرت سودہ بنت زمعہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت زینب بنت خزیمہؓ، حضرت ریحانہؓ وغیرہ کو بھی دینی علوم میں درک تھا اور ان کے مرویات و واقعات حدیث و طبقات کی کتابوں میں موجود ہیں، عام صحابیات میں جن لوگوں کے مرویات اور علمی کمال کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

حضرت فاطمہؓ: جو آپ کی صاحب زادی تھیں، انہوں نے آپ سے متعدد روایتیں کی ہیں اور ان سے حضرات حسنین کے علاوہ امہات المومنین حضرت عائشہؓ، ام سلمہؓ اور حضرت سلمیٰؓ، ام رافعؓ نیز حضرت انس بن مالکؓ نے روایتیں کی ہیں۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ: ان کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کا شرف حاصل ہوا اور ان سے ان کے بیٹوں عبداللہ بن زبیرؓ اور عروہ بن زبیرؓ وغیرہ نے روایت کی ہے۔

حضرت ام عطیہ انصاریہؓ: یہ بڑے درجہ و رتبہ کی مالک تھیں، صحابہ و تابعین ان سے غسل میت کا طریقہ سیکھتے تھے، آپؐ کے ساتھ غزوات میں شریک ہو کر زخمیوں اور مریضوں کا علاج کرتی تھیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت عمرؓ سے روایت کی ہے اور ان سے حضرت انس بن مالکؓ،

محمد بن سیرینؒ اور دوسرے اشخاص نے روایت کی ہے۔

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ: آنحضرت ﷺ سے ان کی روایتیں منقول ہیں اور ان سے متعدد کبار تابعین نے روایت کی ہے۔

حضرت ام شریکؓ: رسول اللہ ﷺ سے ان کی حدیثیں مروی ہیں اور ان سے حضرت جابر ابن عبداللہؓ، عروہ بن زبیرؓ اور سعید بن مسیبؒ وغیرہ نے روایت کی ہے۔

حضرت عاتکہ بنت یزیدؓ: اپنے علم و فضل اور عزت و وقار کی بنا پر اہم صحابیات میں تھیں۔

حضرت ام ایمنؓ (برکہ): آنحضرت ﷺ کی باندی اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کی ماں تھیں، آپ کے ساتھ غزوۂ احد و خیبر میں شریک ہوئیں، زخمیوں کی مرہم پٹی اور مجاہدین کو پانی پلانے کی خدمت انجام دی، رسول ﷺ سے حدیث کی روایت کی ہے اور ان سے حضرت انس بن مالکؓ نے روایت کی ہے۔

حضرت حولا بنت تویتؓ: کو ہجرت و بیعت کا شرف حاصل ہوا، زہد و عبادت میں مشہور تھیں، بخاری، مسلم و موطا میں ان کی حدیثیں درج ہیں۔

حضرت ام الدرداء کبریٰؓ: حافظ ذہبی نے طبقہ صحابہ کے حفاظ میں ان کو شامل کیا ہے اور لکھا ہے کہ فقیہہ، عالمہ، عابدہ، حسینہ اور وسیع العلم و وافر العقل تھیں، رسول اللہ ﷺ اور اپنے شوہر ابودردا سے روایت کی ہے اور ان سے تابعین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔

حضرت زینب بنت ابوسلمہؓ: ام المومنین حضرت سلمہؓ کی صاحب زادی اور فقہائے مدینہ میں تھیں، رسول اللہ ﷺ اور کئی امہات المومنین سے روایت کی ہے اور ان سے تابعین کے ایک گروہ نے حدیث بیان کی ہے۔

حضرت لیلیٰ بنت قانفؓ: سے بعض تابعین نے روایت کی ہے، رسول اللہ ﷺ کی صاحب زادی ام کلثوم کے انتقال پر ان کے غسل و کفن میں شریک تھیں۔

حضرت ام حرام بنت ملحانؓ: حضرت عبادہ بنت صامتؓ کی بیوی تھیں، خلافت عثمانی میں ان کے ساتھ قبرص کی مہم میں شریک ہوئیں اور شہادت پائی، آنحضرت ﷺ سے شرف روایت حاصل ہوا اور ان سے بعض صحابہ و تابعین نے روایت کی ہے۔

حضرت ام سلیم بنت ملحانؓ: حضرت ام حرام کی بہن اور حضرت انس بن مالکؓ کی والدہ تھیں، ان کے دس لڑکے تھے جو سب عالم، محدث اور فقیہ تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے روایت کی ہے اور ان سے حضرت انس بن مالکؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے علاوہ بعض تابعین نے روایت کی ہے۔

حضرت ام فضل لبابہ بنت حارثؓ: یہ رسول اللہ ﷺ کی چچی، حضرت عباسؓ کی زوجہ اور حضرت ابن عباسؓ کی والدہ تھیں، ان سے بہ کثرت حدیثیں مروی ہیں۔

حضرت ام ہانی بنت ابوطالبؓ: حضرت علیؓ کی حقیقی بہن تھیں، صحاح ستہ وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ سے ان کی روایات موجود ہیں، ان سے متعدد تابعین کے علاوہ بعض صحابہ نے بھی روایتیں کی ہیں۔

صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا، اس دور میں بھی عورتوں کا حصہ علمی تعلیمی اور دینی سرگرمیوں میں رہا، ان میں عمرہ بنت عبدالرحمن کا نام بہت ممتاز ہے، یہ انصاری خاتون حضرت عائشہؓ کی تعلیم و تربیت کی سب سے بہتر مثال ہیں، ان کے مرویات کی سب سے بڑی عالم تھیں، حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث مستند ترین سمجھی جاتی ہے جو ان کے یا قاسم یا عروہ کے واسطہ سے ہو، ام المومنین ان سے بڑی محبت کرتی تھیں، ان کی حیثیت ان کے میر منشی کی تھی، لوگ ان کے توسط سے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں خطوط اور تحائف بھیجتے تھے۔

صفیہ بنت شیبہ اور کلثوم بنت عمرو القرشیہ بھی حضرت عائشہؓ کی صحبت یافتہ تھیں، یہ دونوں اور عائشہ بنت طلحہ اور معاذہ بنت عبداللہ العدویہ وغیرہ متعدد تابعات بھی حدیث و روایت میں بڑی ممتاز تھیں۔(۱)

صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں ان کے علاوہ بے شمار ایسی خواتین گزری ہیں جو علم و فضل اور تفقہ میں مشہور ہیں اور ان سے محدثین نے روایت کی ہے، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ۳۰۰ اور تقریب التہذیب میں ۳۵۰ محدث و فقیہ خواتین کا تذکرہ کیا ہے۔

خیر القرون کے بعد کے زمانے کی عورتوں میں بھی علمی شغف و انہماک باقی رہا، خصوصاً

(۱) ہم نے جن خواتین کا ذکر صفحات بالا میں کیا ہے، احادیث، طبقات اور رجال کی کتابوں میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

حدیث کی طلب و تحصیل کے لیے مردوں کی طرح وہ بھی دور دراز جگہوں کا سفر کرتی تھیں، جن کا ذکر تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں موجود ہے۔

محدثین و شیوخ کی درس گاہوں میں عورتوں کے لیے مردوں سے الگ نشست ہوتی تھی اور وہ پردے کے اندر رہ کر مردوں سے اختلاط کے بغیر علم حدیث سیکھتی تھیں اور ان کو اپنے اساتذہ کی طرف سے حدیث کی روایت کی اجازت ملتی تھی، عورتوں کے درس میں مرد بھی شریک ہوتے تھے جو پردے کے پیچھے سے ہوتا تھا، ان کی درس گاہوں میں طلبہ کا بڑا ہجوم ہوتا تھا اور ان کو اپنی شیوخ خواتین سے سند ملتی تھی، عورتوں کی درس گاہیں عموماً ان کے گھروں میں ہوتی تھیں مگر بعض عالمات و فاضلات نے مختلف شہروں میں بھی درس دیے ہیں، خواتین باہم بھی ایک دوسرے سے روایت و سماع کرتی تھیں اور سند و اجازت دیتی تھیں، بہت سی خواتین صاحب تصنیفات تھیں اور ان کی کتابوں پر تخریج بھی لکھی گئی ہے۔

اس زمانے کی بہت سی عورتوں نے فقہ و افتا میں بھی شہرت و ناموری حاصل کی ہے، حفظ قرآن و حفظ حدیث کے علاوہ قرأت، تجوید اور تفسیر میں بعض بعض کا پایہ بلند تھا، وعظ و تذکیر اور خطابت و تقریر میں بعض کو کمال حاصل ہوا، شعر و ادب، کتابت و انشا اور خطاطی میں بھی عورتوں نے اپنے جوہر دکھائے۔

چوتھی صدی ہجری تک عموماً لوگوں کے گھر ہی درس گاہوں کا کام دیتے تھے، باقاعدہ مدارس کا رواج اس کے بعد ہوا تو طبقۂ نسواں کی بھی الگ درس گاہیں وجود میں آئیں جن میں وہی معلّمہ اور معلمہ ہوتی تھیں، ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں صحیفہ ہمام کے مخطوطہ دمشق کے سماعات میں ایک معلّمہ ام الفضل کریمہ بنت ابی الفرس نجم الدین قرشیہ زبیرہ کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اپنے گھر میں ایک مدرسۂ حدیث کھول رکھا تھا، اسی طرح ابوعبید قاسم بن سلام کی کتاب الاموال جو مالیۂ حکومت (فینانس) کے دقیق مسائل پر مشتمل ہے، بسم اللہ کے بعد ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے ''نکوکار، خوش نویس پروفیسر فخر النسا کو جو سوزن ساز ابونصر احمد بن فرج بن عمر دینوری کی دختر ہیں، بغداد میں ان کے گھر پر سنا کر سند حاصل کی گئی ہے۔(۱)

(۱) صحیفہ ہمام بن منبہ دیباچہ، ص ۱۴، مطبوعہ حیدر آباد، ۱۹۵۵ء۔

علم وفن میں عورتوں کے اشتغال اور امتیاز کا اعتراف علمائے اسلام نے بھی فراخ دلی سے کیا ہے اور ان کی علمی خدمت کی تحسین کی ہے اور ان کو ممتاز القاب بخشے ہیں۔

عہد سلف کی خواتین اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت سے بھی غافل نہیں رہتی تھیں، ان کی تعلیم و تربیت کے بعض واقعات کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔

امام ربیعہ رائے مدینہ کے بلند پایہ عالم وفقیہ اور امام مالکؒ کے برگزیدہ استاذ تھے، یہ ابھی شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کے والد ابوعبدالرحمن فروخ بنو امیہ کے دور میں بہ سلسلہ جہاد خراسان گئے اور ستائیس برس بعد گھر جب لوٹے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو ربیعہ نکلے اور دیکھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے ہے، ربیعہ نے کہا تم میرے گھر پر حملہ کرنے والے کون؟ فروخ نے کہا تم میرے گھر کے اندر جانے والے کون؟ بات بڑھی اور ہاتھا پائی شروع ہوگئی، شور وغل سن کر محلے کے لوگ جمع ہوگئے اور امام مالکؒ وغیرہ بھی اپنے استاذ کی مدد کے لیے آگئے، فروخ کا نام سن کر ربیعہ کی والدہ بھی آگئیں اور بتایا کہ یہ میرے شوہر ہیں اور وہ میرا لڑکا ہے، آپ اس کی پیدائش سے پہلے ہی جہاد کے لیے روانہ ہوگئے تھے، اس کے بعد باپ بیٹے گلے مل کر روئے، فروخ نے بیوی سے وہ تیس ہزار دینار طلب کیے جو دے کر جہاد پر روانہ ہوئے تھے، بیوی نے کہا میں نے مال دفن کر دیا ہے، چند دن بعد حاضر کروں گی، ایک روز جب امام ربیعہ مسجد نبوی میں درس حدیث دینے گئے تو بیوی نے شوہر سے کہا، مسجد میں نماز پڑھ لو، وہ گئے تو ربیعہ کا درس ہو رہا تھا جس کا حلقہ بڑا وسیع تھا، یہ وہیں قریب کھڑے ہوگئے، امام ربیعہ سر نیچا کیے درس دیتے رہے، ان کے سر پر لمبی ٹوپی تھی اس کی وجہ سے فروخ کو پہچاننے میں دشواری ہوئی، لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ربیعہ بن ابوعبدالرحمن فروخ ہیں، فروخ نے گھر آکر بیوی سے کہا، اللہ نے تیرے لڑکے کا رتبہ بلند کیا، میں نے اسے علم وفضل میں سب سے بڑھ کر پایا، بیوی نے کہا، کیا آپ کو تیس ہزار دینار پسند ہیں یا اپنے لڑکے کی یہ زندگی، فروخ نے کہا نہیں مجھے یہ بات پسند ہے، بیوی نے کہا، وہ ساری رقم میں نے لڑکے کی تعلیم و تربیت پر خرچ کر دی ہے، فروخ نے کہا تم نے یہ رقم ضائع نہیں کی اور میری کمائی بڑے کام آئی۔ (۱)

(۱) وفیات الاعیان، ج ۱، ص ۲۲۵، ۲۲۶۔

امام مالک فرماتے ہیں" میں نے اپنی والدہ سے عرض کی کہ میں پڑھنے جاؤں گا تو ماں نے کہا، آؤ میں تم کو علما کا لباس پہنا دوں، پھر تم جا کر حدیث کا درس حاصل کرو، چنانچہ میری ماں نے مجھے کپڑے پہنائے، سر پر لمبی ٹوپی رکھی، اس کے اوپر عمامہ باندھا اور کہا، اب جاؤ حدیث پڑھو"۔ (۱)

امام سفیان ثوری کو ان کی ماں نے سوت کات کر پڑھایا اور ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اور کہا، جب تم دس حدیثیں پڑھ لو تو دیکھو کہ نیک چلنی، بردباری اور حلم ووقار میں اضافہ ہوا یا نہیں، اگر تم کو ان میں زیادتی نظر نہ آئے تو سمجھو کہ یہ علم تمہارے حق میں مفید نہیں بلکہ مضر ہے۔ (۲)

امام اسماعیل بن علیہ کے والد کا نام ابراہیم بن مقسم تھا مگر وہ اپنی والدہ علیہ بنت حسان ہی کی نسبت سے مشہور ہوئے (۳) کیوں کہ ماں ہی کے زیر سرپرستی ان کی تمام تر تعلیم و تربیت ہوئی، جو بڑی عالمہ وفاضلہ تھیں، ماں نے اپنے بیٹے اسماعیل کو امام عبدالوارث کے سپرد کیا تا کہ وہ انہیں علم، ادب اور اخلاق سکھائیں، امام ابراہیم حربی کا بیان ہے کہ جب وہ اپنے استاد سے تعلیم حاصل کر چکے تو اہل بصرہ استاد سے زیادہ انہیں ثقہ ومعتمد سمجھتے تھے۔ (۴)

امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام بخاریؒ اور دوسرے متعدد ائمہ اسلام کی تعلیم و تربیت ان کی ماؤں کی دل چسپی کا نتیجہ ہے۔

مسلمانوں کی جو حکومتیں مختلف ملکوں میں قائم ہوئیں، ان میں اندلس کی اموی، مصر کی فاطمی، ترکی کی عثمانی، ہندوستان کی مملوک ومغل حکومتیں زیادہ مشہور ہیں، ان کے علاوہ بھی متعدد چھوٹی بڑی حکومتیں تھیں، ان سب کی علم دوستی اور ادب نوازی کے واقعات پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ ابنائے اسلام کی طرح بنات اسلام کو بھی ہر دور میں علم سے والہانہ شغف رہا ہے اور انہوں نے گوناگوں مفید علمی وتعلیمی اور دینی کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن ایک مضمون میں یہ سب تفصیل پیش کرنا ممکن نہیں۔

(۱) المحدث الفاصل بین الراوی والواعی، ص ۲۰۱ بحوالہ بنات اسلام کی دینی وعلمی خدمات، ص ۵۸ (۲) ابوالقاسم حمزہ بن سہمی، تاریخ جرجان، ص ۴۴۹، طبع اول، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۵۰ء (۳) تذکرۃ الحفاظ، ج ۱ ص ۲۹۵ (۴) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۶ ص ۲۳۱۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ علمی وتعلیمی سرگرمیوں میں عورتوں کا حصہ بہت وافر اور نمایاں رہا ہے، اس بنا پر عورتوں کو علم وتعلیم سے محروم رکھنے کا جو تصور ورجحان پیدا ہوگیا تھا اور جس کا اثر ابھی تک قائم ہے، وہ سراسر غلط ہے، اگر اب بھی عورتوں کی تعلیم وتربیت کی جانب توجہ نہیں کی گئی تو اس سے ملی وقومی زندگی کا ایک پہیہ بیکار اور معطل ہو جائے گا اور آیندہ نسلوں کو بھی اس کا علمی وتعلیمی خسارہ برداشت کرنا ہوگا۔

ممکن ہے یہ خیال کی جائے کہ جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، وہ دینی علوم میں عورتوں کے تبحر وجامعیت سے متعلق ہیں، ان سے ان کی عصری اور غیر دینی علوم کی تحصیل وممارست کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، حالاں کہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ حضرت عائشہؓ وغیرہ خواتین اسلام کو مذہبی علوم کی طرح اپنے دور کے مروجہ علوم میں بھی دست گاہ تھی، تاہم اس شبہ کا مزید ازالہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱- اس کا سادہ جواب تو یہ ہے کہ اگر عصری علوم کی تحصیل مرد کر سکتے ہیں تو عورتیں کیوں نہیں کر سکتیں، کیوں کہ پہلے یہ اچھی طرح واضح کیا جاچکا ہے کہ علم وتعلیم کے معاملہ میں اسلام نے نہ مرد وعورت میں کوئی فرق روا رکھا ہے اور نہ اس پر کسی کی اجارہ داری پسند کی ہے بلکہ حکمت ودانش وری کو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز بتایا ہے اور یہ جہاں سے بھی حاصل ہو سکے اسے مسلمان کو حاصل کرنا چاہیے، کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قدیم اور دینی علوم کی طرح عصری اور غیر دینی علوم کی تحصیل بھی مسلمانوں کو کرنی چاہیے اور جو علم مسلمان مرد حاصل کر سکتے ہیں وہ عورتیں بھی حاصل کریں گی۔

۲- حضرت عائشہؓ اور بعض دوسری خواتین کے دینی علوم میں دست گاہ کے ضمن میں یہ امر بھی واضح کیا جاچکا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مروج علوم میں بھی درخور رکھتی تھیں، مثلاً تاریخ، انساب، شعر وادب اور طب وغیرہ، جو ظاہر ہے کہ خالص دینی علوم نہیں تھے، اس لیے آج کل بھی عورتیں یہ یا اس زمانے کے مروج علوم کو حاصل کریں تو اسے غلط اور ناجائز کیسے کہا جائے گا، ہر زمانے کے حالات، ضروریات اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں، جو غیر دینی علوم پہلے رائج تھے اب زمانے کے حالات وتقاضوں کی وجہ سے ان میں تغیر وتبدل واقع ہوگیا ہے، ان کی نئی نئی شاخیں

اور نئے نئے شعبے پیدا ہوگئے ہیں بلکہ بعض ایسے علوم پیدا ہوگئے ہیں جن کا پہلے وجود ہی نہ تھا، ایسی صورت میں قابل غور امر یہ ہے کہ جب پہلے زمانے کے لوگوں نے اس زمانے کے رائج علوم کے حصول کو قبیح اور معیوب نہیں سمجھا تو اس زمانے میں ان میں جو اضافے اور تبدیلیاں ہوگئی ہیں یا جو نئے علوم وجود میں آگئے ہیں، ان کو حاصل کرنے میں کیا شرعی مانع ہو سکتا ہے، مثلاً حضرت عائشہؓ اور خود جناب رسالت مآب ﷺ کو بھی طب سے یک گونہ واقفیت تھی اور آپ سے بہت سے نسخے بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔(۱)

ظاہر ہے طبی علاج کے جو سادہ طریقے رائج ہوں گے، ان ہی کے مطابق آپ نے اور اس زمانے کے طب سے واقفیت رکھنے والے لوگوں نے علاج کیا ہوگا، اس کے بعد مسلمانوں میں یونانی علوم وفنون کا رواج ہوا تو انہوں نے طب یونانی کے مطابق علاج معالجہ شروع کیا اور اس میں کوئی قباحت نہیں محسوس کی لیکن اب موجودہ زمانے میں میڈیسن اور علم الادویہ نے جو ترقی کی ہے، اس کے علاوہ موسموں اور ملکوں کی تبدیلی اور آب وہوا کے تغیر سے گوناگوں نئے نئے امراض پیدا ہوگئے ہیں اور ان کی نسبت سے طریق علاج اور ادویہ کے دائروں میں بھی وسعت پیدا ہوگئی ہے جن کے لیے باقاعدہ شفاخانے اور اسپتال قائم کیے جارہے ہیں اور مختلف امراض میں اختصاص Specialisation کا دور شروع ہوگیا ہے، مثلاً ناک، کان، آنکھ، دل اور گردے کے امراض کے الگ الگ ماہر اور ڈاکٹر ہوتے ہیں، اسی طرح مردوں اور عورتوں کی بعض بیماریاں بالکل مختلف ہوتی ہیں اور ان کے ماہرین بھی الگ الگ ہوتے ہیں، کیا اس کو نئی چیز سمجھ کر مسترد کیا جا سکتا ہے حالاں کہ عہد رسالت کے ایک واقعہ سے اسپیشلائیزیشن کا ثبوت بھی ملتا ہے، آپ کے زمانے میں ایک صاحب بیمار ہوئے، آپ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے قبیلے اور محلے میں کوئی طبیب ہے؟ بتایا گیا کہ دو آدمی ہیں، آپ نے فرمایا جو زیادہ ماہر ہوں ان کو بلاؤ، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص کو طب سے واقفیت نہ ہو اگر وہ علاج کرے تو اسے سزا دو، کیوں کہ اناڑی پن سے نقصان ہو سکتا ہے۔(۲)

(۱) بعض علمائے اسلام نے طب نبوی پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں جن کے نام کتب فہارس میں درج ہیں

(۲) خطبات بہاول پور، ص ۲۳۵۔

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں جو عورتیں طب سے واقف تھیں، وہ اس زمانے کے دستور کے مطابق سادہ مفردات سے علاج کرتی رہی ہوں گی، لیکن اس زمانے میں امراض کی کثرت اور علاج کے دائرے میں وسعت کی بنا پر انہیں بھی مردوں کی طرح ان سب سے واقف ہونے کی ضرورت ہے، خصوصاً نرسنگ کی اہمیت و ضرورت اور عورتوں کی اس سے مناسبت کی بنا پر انہیں خاص طور پر اس کی تعلیم دینی چاہیے، اس کا ابتدائی خاکہ عہد نبوت میں ملتا ہے کہ ازواج مطہرات اور دوسری صحابیات غزوات میں شریک ہوتی تھیں اور مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں اور مجروحین کی مرہم پٹی کرتی تھیں، شفاخانے اور اسپتال میں موجودہ دور میں مختلف شعبے قائم ہوگئے ہیں اور ان کی موجودہ شکل بڑی ترقی یافتہ ہوگئی ہے مگر سب سے پہلا شفاخانہ عہد نبوت ہی میں قائم ہوگیا تھا، یہ خاص مسجد میں تھا اور ایک خاتون رفیدہ اسلمیہ کے زیر نگرانی تھا۔(۱)

حقیقت یہ ہے کہ میڈیکل تعلیم اس زمانے میں عورتوں کے لیے اس بنا پر زیادہ ضروری ہوگئی ہے تاکہ مسلمان عورتوں کو غیر مسلم یا عام مرد ڈاکٹروں سے علاج نہ کرانا پڑے، میڈیکل تعلیم حاصل کرکے عورتیں شریعت کے ایک بنیادی مسئلہ اور ضرورت کو پورا کرنے میں معاون ہوں گی اور اس تعلیم کو نہ حاصل کرنے کی وجہ سے شریعت کے متعدد احکام کی خلاف ورزی ہوسکتی ہے۔

علوم کی تقسیم مغرب کی ایجاد ہے اور بالفرض جن علوم کو غیر اسلامی سمجھا جاتا ہے وہ اگر واقعتاً ممنوع ہوتے تو آنحضرت ﷺ بعض صحابہ کو دوسری زبانیں اور غیر قوموں کے علوم سیکھنے کا حکم کیوں دیتے، حضرت زید بن ثابتؓ کو آپ نے خاص طور پر عبرانی زبان اور رسم الخط سیکھنے کا حکم دیا تھا(۲)، حضرت زید عربی و عبرانی کے علاوہ قبطی اور فارسی زبان بھی جانتے تھے، حضرت سلمانؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام فارسی زبان سے واقف تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ بھی عبرانی زبان جانتے تھے۔(۳)

۳- غلط فہمی کا اصلی سبب یہ ہے کہ عورت کا دائرۂ عمل محض گھر تک محدود سمجھ لیا گیا ہے اس لیے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ انہیں بہ قدر ضرورت دینی احکام و مسائل سے واقفیت بہم پہنچا لینے

(۱) ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ج ۸، ص ۸۱، مصر، ۱۹۰۷ء (۲) فتوح البلدان بلاذری و تاریخ طبری واقعات ۴ھ، ص ۱۴۶۰ (۳) خطبات بہاولپور، ص ۲۳۲ و ۲۳۳۔

پر اکتفا کر لینی چاہیے، مگر عورت کے دائرۂ عمل کی اس تحدید کی کوئی ایسی شرعی دلیل موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس کے لیے دوسرے اجتماعی یا انفرادی کام کرنا ممنوع قرار دیا جاسکے، ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں عورتیں باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے مسجدوں میں آتی تھیں، وہ رسول اللہ ﷺ کے وعظ و ارشاد کے ان اجتماعات میں بھی شریک ہوتی تھیں جن میں مرد موجود رہتے تھے اور آپؐ نے ان کی سہولت کے لیے وعظ و ارشاد کی الگ مجلس کا نظم کر دیا تھا۔(۱)

عورتیں گھر کے باہر کا کام بھی کرتی تھیں، حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ جو حضرت زبیرؓ کی زوجہ محترمہ تھیں، ایک دن گھاس کا گٹھا لے کر آرہی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو اپنے اونٹ پر سوار کرنا چاہا مگر وہ شرم کی وجہ سے آپؐ کے ساتھ اونٹ پر نہ بیٹھیں۔(۲)

تعلیم و تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا کام بھی مردوں کی طرح عورتیں انجام دیتی تھیں، متعدد عورتوں کا جنگ و جہاد میں جانا اور حصہ لینا قطعی طور پر ثابت ہے، یہ خواتین آنحضرت ﷺ کی مرضی و ہدایت پر شریک جہاد ہوتی تھیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں زخمیوں کے علاج اور بیماروں کی تیمارداری کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی کیوں کہ اس طرح کے کام تربیت اور ٹریننگ کے بغیر انجام نہیں دیے جاسکتے، میدان جنگ میں پانی پلانے کے لیے بھی تربیت کی ضرورت ہے، حضرت فاطمہؓ نے آنحضور ﷺ کے زخموں میں چٹائی جلا کر اس کی راکھ بھری تو خون بند ہوا، خون بند کرنے اور زخم مندمل کرنے کا یہ طریقہ سیکھے بغیر عین وقت پر اختیار کرنا ممکن نہیں تھا۔(۳)

۴- شریعت اسلامی نے صنف لطیف کو بعض صورتوں میں ایسے احکام دیے ہیں جو اسے گھر سے باہر قدم نکالنے اور غیر دینی علوم سیکھنے کو ضروری بنا دیتے ہیں، مثلاً اگر مسلمانوں کی کسی بستی پر حملہ ہو اور مردوں کی تعداد مقابلے کے لیے کافی نہ ہو تو اس وقت عورتوں کے لیے جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اور اس کے لیے ان کو اپنے شوہروں سے اجازت لینی بھی ضروری نہیں ہے بلکہ

(۱) صحیح بخاری، کتاب العلم باب ہل یجعل للنساء یوم علی حدة فی العلم (۲) محمد بن سعد، کتاب الطبقات الکبیر جزء ثامن فی النساء تذکرہ اسماء، مطبع بریل لیڈن ۱۳۲۱ھ (۳) صحیح بخاری کتاب المغازی، باب ما اصاب النبی ﷺ من الجراح یوم احد، ج ۲ ص ۵۸۴ و صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب غزوہ احد، ج ۲، ص ۹۰۔

اگر وہ اس سے روکیں تو ان کی اطاعت کرنا جائز نہیں ہے۔

موجودہ دور میں جنگ کی صورت پہلے سے بہت مختلف ہوگئی ہے، اب جنگ رائفل، مشین گن، توپ، میزائیل، ایٹم بم، زہریلی گیس، ٹینک اور ہوائی جہاز وغیرہ سے ہوتی ہے، کیا ایسی جنگوں میں تربیت اور ٹریننگ کے بغیر حصہ لیا جاسکتا ہے، اگر ایسے موقعوں پر جنگ میں عورت کی شرکت ضروری ہے تو موجودہ طریقہ جنگ سے واقف ہونا اور اس کی تربیت حاصل کرنا بھی ان کے لیے ضروری ہوگا، حضرت ام سلیمؓ نے جنگ حنین کے موقع پر ایک خنجر تیار کیا تھا، آنحضرت ﷺ کو اس کا علم ہوا تو ان سے اس کی وجہ دریافت کی، بولیں اگر کوئی مشرک میرے قریب پھٹکے گا تو اس کا پیٹ پھاڑ ڈالوں گی، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ ہنسنے لگے۔(۱)

۵ - ملٹری سائنس کے اس دور میں مسلم عورتوں کو حفاظت و دفاع کی تربیت نہ دینا اور بلا دلیل یہ خیال کرلینا کہ عورتوں کی جگہ صرف گھر میں ہے اور انہیں صرف دینیات اور امور خانہ داری کی تعلیم پر قناعت کرنا چاہیے، کس قدر غلط اور شریعت کے منافی خیال ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ملٹری سائنس کے لیے انگریزی زبان جاننا بھی ضروری ہے تو کیا عورتوں کو اس لیے انگریزی سیکھنے سے باز رکھا جائے گا کہ یہ غیر قوم کی زبان اور علم ہے، عورتوں کی تعلیم کے لیے جہاں تک ممکن ہو استانیاں بھی عورتیں ہی ہونا چاہیے، اس حیثیت سے بھی عورتوں کو انگریزی اور ملٹری سائنس کی تعلیم دی جانا چاہیے کہ ان چیزوں کو پڑھانے کے لیے بہ آسانی عورت ٹیچر مہیا ہوسکے۔

اس زمانے میں عموماً کہیں نہ کہیں جنگ ہر وقت ہوتی رہتی ہے، اس میں عورتیں اور بچے اس لیے زیادہ مارے جاتے اور تباہ ہوتے ہیں کہ وہ دفاعی حفاظت کے فن سے ناواقف ہوتے ہیں، اس طرح تحفظ کے نقطۂ نظر سے عورتوں کے لیے ملٹری سائنس کا علم ضروری ہوگیا ہے۔

یہ ملٹری سائنس ہی کی دین ہے کہ بعض اوقات محاذ جنگ ہزاروں میل تک پھیلا ہوا ہوتا ہے، اتنے طویل محاذ پر مقابلے کے لیے محض مرد کافی نہیں ہوسکتے اور اگر کافی بھی ہوجائیں تو اندرون ملک کے دوسرے کام کون انجام دے گا، مواصلات، ریلوے، بینکنگ اور دوسرے دفاتر

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب غزوۃ النساء مع الرجال، ج ۲، ص ۱۰۳

اور کارخانوں میں کام کرنے کے لیے یقیناً عورتوں کی ضرورت ہوگی، اس لیے ان کے لیے ان کاموں کی تعلیم و تربیت حاصل کرنا ناگزیر ہے، موجودہ زمانے میں اسلامی ممالک اولاً تو دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہیں، ثانیاً وہ یورپ کے ترقی یافتہ اور بڑے ملکوں کے مقابلے میں فنون جنگ سے واقفیت اور ساز و سامان اور ہتھیاروں وغیرہ کے لحاظ سے بہت کم تر اور کم مایہ ہیں، ایسی صورت میں عورتوں کی جنگ میں شرکت یا کم از کم اندرون ملک کی ذمہ داریاں سنبھالنا ضروری ہے، ویٹ نام میں امریکہ کے مقابلے میں محاذ جنگ مردوں نے اور اندرون ملک کا کاروبار عورتوں نے سنبھالا تھا۔

۶ - آج جن قانونی و دستوری حقوق اور ملی مفاد وغیرہ کے حصول کے لیے مسلمانوں اور ان کی تنظیموں کو جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے، ان پر قابو پانے کے لیے بھی عورتوں کی تعلیم ضروری ہے، ملک کے سیاسی مسائل و حوادث، موجودہ عالمی حالات اور بین الاقوامی رجحانات اور دشمنانِ اسلام کے خطرناک عزائم اور منصوبوں سے واقف ہونے کے لیے بھی عورتوں کو جدید تعلیم سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔

۷ - جن علوم کو غیر دینی قرار دے کر مسلمانوں اور خصوصاً طبقۂ نسواں کو ان سے روکا جاتا ہے، وہ دراصل غیر اسلامی نہیں ہیں، قرآن مجید میں مختلف قوموں، پیغمبروں، بادشاہوں اور بعض دوسرے اشخاص کا تذکرہ ہے، شہروں، ملکوں، پہاڑوں، سمندروں کا ذکر بھی آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ، جغرافیہ، سیر اور انساب وغیرہ کا علم سیکھنا قرآن مجید کی رو سے ممنوع نہیں ہوسکتا، اسی طرح سائنس، عمرانیات، نفسیات، طبیعیات، زولوجی، فلسفہ، حیوانات، نباتات، جمادات، انسان، علم الجنین، ہیئت، کیمیا، طب و ادویہ اور موتیوں وغیرہ کا ذکر بھی کسی نہ کسی پیرایہ میں ہوا ہے، مثلاً علم ہیئت کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے کہ اس کے ذریعہ رات کے وقت مسافر اپنا راستہ معلوم کرتے تھے، شہور و سنین اور نماز، روزہ اور حج کے اوقات کا تعین ہوتا ہے، آنحضور ﷺ بھی اس سے واقف تھے اور مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت قبلہ کے رخ اور سمت کے تعین کا مسئلہ اٹھا تو آپ کی ہیئت سے واقفیت کام آئی (۱)، علم جنین کا ذکر تخلیق انسانی کے ضمن میں آیا ہے

(۱) ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں "مشہور سرجن ڈیکائی کو بچوں کی ولادت کے علم سے دل چسپی (بقیہ اگلے صفحے پر)

شمس وقمر اور آسمان وزمین کے مسخر کیے جانے کا ذکر کر کے سائنس کی ضرورت واحتیاج بیان کی گئی ہے، فلسفہ کا ذکر وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا کہہ کر فرمایا ہے، آنحضرت ﷺ نے شجرہ انساب کو سیکھنے کی تلقین فرمائی تو اس کی یہ مصلحت بھی بیان کی کہ تاکہ کوئی محرم سے نکاح نہ کر لے، عسکریت، سیاحت اور تیراکی وغیرہ کو سیکھنے کی بھی آپ نے ترغیب و تشویق دلائی اور تاکید کی ہے۔

غرض موجودہ زمانے کے اکثر علوم کی بنیاد قرآن مجید میں موجود ہے، اس لیے اگر مسلمان مردوں کو قرآن فہمی کے لیے ان کو حاصل کرنا ضروری ہے تو کیا عورتوں کے لیے قرآن فہمی ضروری نہیں ہے، پھر آخر کس دلیل سے یہ کہا جاتا ہے کہ انہیں احکام و مسائل بہ قدر ضرورت حاصل کرنے ہی پر قناعت کرنا چاہیے۔

۷- آج کل تمام علوم وفنون پر یورپ کا تسلط ہے، مغرب نے اپنے رنگ میں رنگ کر ان علوم کو الحاد، دہریت اور خدا بیزاری کا حامل بنا دیا ہے، اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان مرد وعورت ان علوم کو حاصل کریں اور ان کو یورپ کے ملحدانہ اثرات سے پاک کر کے اسلامی رنگ میں رنگ دیں اور یہ سمجھ لیں کہ یہ علوم غیر اسلامی نہیں ہیں بلکہ لوگوں کے غلط استعمال نے ان کو غیر اسلامی اور باطل بنا دیا ہے، اصل چیز نیت اور عمل ہے، اگر نیت اور عمل ٹھیک ہو تو یہ سارے علوم ہمارے لیے خیر و برکت کا سامان بن سکتے ہیں اور اگر نیت اور عمل درست نہ ہو تو خالص اسلامی سمجھے جانے والے علوم بھی تباہی و بربادی کا موجب ہو جاتے ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی علوم کی طرح عصری علوم سائنس، ٹکنالوجی، ریاضی،

(بقیہ ص ۳۵۹ کا) ہے، وہ بیان کرتا ہے کہ علم جنین کے متعلق جو تفصیلات قرآن مجید نے دی ہیں ان کا علم نہ یونان کے مشہور قدیم اطبا کو تھا اور نہ زمانہ حال کے یورپی لوگوں کو ہے، جنہوں نے سالہا سال تک اس موضوع پر ریسرچ کی لیکن اب سے چودہ سو سال قبل ایک بدوی اس کا ذکر کرتا ہے تو یقیناً یہ انسان کا کلام نہیں ہونا چاہیے قرآن کی اسی بات سے متاثر ہو کر اب سے دو ماہ پہلے ڈیکائی نے اپنے مسلمان ہونے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہمیں بیالوجی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ حیوانات اور موتیوں کا بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے''۔

(خطبات بہاولپور ص ۲۳۲، ۲۳۵)

سیاسیات، میڈیسن، انجینئرنگ، تاریخ، جغرافیہ، انگریزی اور دوسری زبانوں کا جاننا عورتوں کے لیے مردوں سے کم ضروری نہیں ہے، ان کو غیر ضروری اور غیر دینی کہہ کر نظر انداز کرنا یا عورتوں کو ان کی تعلیم سے روکنا ایک بڑا اور عظیم قومی خسارہ ہے اور آج مسلمان اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں، کاش وہ اس حقیقت کو سمجھ کر اس کی تلافی کی فکر کرتے، یالیت قومی یعلمون۔

۸- بالفرض اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ سب غیر دینی علوم ہیں تو کیا اپنے دین کی طرح اپنی دنیا کو بنانا اور سنوارنا ضروری نہیں ہے اور کیا عورتیں اپنی عاقبت ہی بنائیں اور دنیا کو جہنم بننے کے لیے چھوڑ دیں، ہر مسلمان مرد اور عورت پنج وقتہ نمازوں کے بعد اس کی دعا کرتا ہے کہ:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً	اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی اچھائی
وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا	اور کامیابی عطا فرما اور آخرت میں بھی۔ اور
عَذَابَ النَّارِ (بقرہ ۲: ۲۰۱)	دوزخ کے عذاب سے بچا۔

کیا اس کا اقتضا یہ نہیں ہے کہ مسلمان مرد وعورت اپنی عاقبت کو بہتر بنانے کے لیے دینی علوم میں بصیرت پیدا کریں اور دنیا کو بہتر اور عمدہ بنانے کے لیے جدید علوم میں مہارت حاصل کریں اور دوسروں کے رہین منت ہونے کے بجائے علمی و تعلیمی میدان میں ان سے گوئے سبقت لے جائیں۔

مخلوط تعلیم

عورتوں کی تعلیم کے ضمن میں آخری اور پیچیدہ مسئلہ مخلوط تعلیم کا ہے، اسلامی ملکوں میں یہ زیادہ پریشان کن اور دشوار نہیں ہے، وہ زنانہ اسکول، کالج اور یونی ورسٹیاں قائم کر سکتے ہیں تاکہ عورتیں بھی اعلا تعلیم سے محروم نہ رہیں لیکن سیکولر اور جمہوری ملکوں میں یہ مسئلہ بڑا اہم ہے، اس طرح کے ملکوں میں عورتوں کی تعلیم کا کوئی علاحدہ نظام نہیں ہوتا، وہ مردوں کے ساتھ ہی تعلیم حاصل کرتی ہیں اور مرد وعورت کا یہ اختلاط ضررناک ہے جو شریعت کے خلاف ہے، اس نے پردہ کا حکم دیا ہے، اگر شریعت کے حکم پر عمل کیا جائے تو عورتیں تعلیم سے محروم رہیں گی اور اگر تعلیم حاصل کرتی ہیں تو علاوہ فساد وضرر کے شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے استفادے کے لیے مسجد نبوی میں مردوں کے

ساتھ عورتیں بھی ہوتی تھیں اور وہ نماز باجماعت کے لیے بھی مسجد آتی تھیں، ظاہر ہے ان کی صفیں اور نشستیں مردوں سے الگ ہوتی رہی ہوں گی اور اگر مخلوط ہوتی رہی ہوں تو ایسا پردہ کا حکم آنے سے پہلے ہوا ہوگا، چنانچہ بعد میں عورتوں کے مطالبے پر آپ نے وعظ و تذکیر کے لیے عورتوں کی نشست کا الگ انتظام کردیا تھا۔

ازواج مطہرات سے مرد جب کوئی بات دریافت کرتے تو وہ پردے کے پیچھے سے سوال کرتے تھے، حضرت عائشہؓ کے درس میں غیر محرم لوگ ان کے حجرے کے باہر ہوا کرتے تھے، بعد میں بھی یہی صورت اختیار کی گئی کہ جو مرد عورتوں سے حصول علم کرتے تھے وہ اور مردوں سے علم حاصل کرنے والی عورتیں پردے کے پیچھے سے اکتساب علم کرتی تھیں، اگر اس طرح کی صورت اس وقت بھی اختیار کی جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، غیر مسلم مردوں سے بھی اگر عورتیں پردے کے اہتمام کے ساتھ علم حاصل کریں تو اس کی گنجائش موجود ہے کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے بدر کے قیدیوں سے مسلمان بچوں اور بچیوں کو تعلیم دلائی تھی، آج کل ہمارے ملک میں بھی لڑکیوں کے علاحدہ اسکول اور کالج قائم ہیں، ظاہر ہے ان میں مسلمان بچیوں کا تعلیم حاصل کرنا کسی طرح معیوب نہیں ہے، خود مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ جس طرح طلبہ کے لیے اپنے اسکول اور کالج قائم کرتے ہیں، اسی طرح طالبات کے لیے بھی قائم کریں اور مخلوط تعلیم کی مضرتوں سے بچنے کے لیے بعض شہروں اور قصبات میں ان کے اپنے اسکول اور کالج قائم بھی ہیں، تاہم ہائر ایجوکیشن کا مسئلہ ابھی تک لاینحل ہی ہے، عورتوں کو اعلا تعلیم تک پہنچنے میں اس لیے بھی دشواری ہوتی ہے کہ وہ شادی کے بعد جب صاحب اولاد ہوجاتی ہیں تو ان کے لیے تعلیم کا حصول ممکن نہیں رہتا، البتہ تعلیم دینے میں ان کو اتنی دشواری نہیں ہوتی۔

اگر مخلوط تعلیم سے مفر کی کوئی صورت نہ ہو تب بھی چوں کہ تعلیم لابد ہے، حالات اور ضرورت شدیدہ کی بنا پر ان اداروں اور درس گاہوں میں مسلمان بچیاں تعلیم حاصل کرسکتی ہیں جہاں پردے کا اہتمام نہ ہو اور مردوں کے اختلاط سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو کیوں کہ یہ ایک اضطراری حالت ہے اور اضطرار میں حرام بھی حلال ہوجاتا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے صحیح بخاری کی کتاب الجہاد کے باب مداواۃ النساء الجرحی فی الغزو اور باب رد النساء الجرحی والقتلی میں ربیع بنت معوذ کی اس

روایت کہ ''ہم نبی ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک رہتی تھیں اور مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں اور ان کی خدمت کرتی تھیں اور مقتولین و مجروحین کو مدینہ واپس لاتی تھیں'' کی شرح میں لکھا ہے کہ اس سے ضرورت پڑنے پر اجنبی عورت کے اجنبی مرد کا علاج کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے (۱) مگر دل سے اس کو برا ہی سمجھنا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو والدین اور سرپرست ان کی پوری نگرانی اور دیکھ بھال کریں تاکہ مخلوط تعلیم کے مفاسد اور قبائح سے جس قدر ممکن ہو محفوظ رہا جاسکے، ہر حال میں نیت کی پاکیزگی اور اخلاص ضروری ہے، ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ عورتیں بے پردہ ہوجائیں، تاہم علم سیکھنا اس زمانے میں ان کے لیے بہت ضروری ہے، تعلیم سے ان کی بے گانگی کا نقصان ان ہی تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کا اثر لامحالہ نئی نسلوں پر بھی پڑے گا، جس سے غفلت قومی جرم ہے۔

---

(۱) فتح الباری کتاب الجہاد ابواب مذکورہ، ج ۶، ص ۶۰۔

پاکستان میں دارالمصنفین کے نئے نمائندے

جناب حافظ سجاد الٰہی صاحب

Address

Office: 27 A, Peco Mall Godam Road
Loha Market, Badami Bagh
Lahore, Pakistan.

Phone: 03004682752

Home: 196, Ahmad Block Badar Street,
New Garden Town
Lahore, Pakistan.
Phone (R): 5863609

علامہ شبلی کی فارسی شاعری — ایک تعارف

پروفیسر عبدالقادر جعفری☆☆

روشنم شد ز نوانجی شبلی کامروز　　ہند را نیز قتی ہست وصفاہانی ہست(۱)

علامہ شبلی کی شاعری کو ان کے دور کی سیاست و تہذیب کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو وہ حقیقت سے قریب تر ہوگی کیوں کہ شبلی کے ذہن کی تعمیر و تشکیل کرنے والے عناصر کا سراغ وہیں سے ملتا ہے اور جب تک ان پہلوؤں کا علم نہ ہوگا شبلی کی شاعری کو سمجھنا اور ان کے ادبی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنا اور قوم کے تہذیبی سرمایہ میں ان کی جگہ مقرر کرنا تقریباً ناممکن ہوگا جس سے شبلی متاثر ہوئے اور جسے شبلی نے متاثر کیا ان نکات کو مدنظر رکھ کر شبلی کے شعری شعور کی جستجو اس مقالے میں کی گئی ہے۔

علامہ شبلی مختلف الابعاد شخصیت کے مالک اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے ان کی شاعری اور تصانیف میں جدت، آزادی رائے اور فکری گہرائی پائی جاتی ہے وہ مذہبی علوم کے عالم اور تاحدے جدید آراء و خیالات سے واقف تھے، قدیم علما اور جدید اسکالروں کی صحبت میں رہے وہ محقق، ادیب، شاعر، انشاپرداز، خطیب، مورخ، مفکر، مصلح اور سیاست داں تھے وہ تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو تاریخ کا ایک اساسی اصول تصور کرتے تھے، مگر ارتقا سے ان کی مراد یہ نہیں کہ تاریخ کا ہر قدم جو حال سے مستقبل کی طرف بڑھتا ہے لازمی طور پر صحیح ہو یا یہ کہ تہذیب جتنی آگے بڑھے گی صالح تر ہوگی ان کا ارتقائی تصور صرف تسلسل کے اصول تک محدود ہے کیوں کہ ان کے نزدیک فلسفہ تاریخ کا سنگ بنیاد صالح معاشرہ کے چند قدرتی قوانین پر مبنی ہے اس پر جتنا عمل کیا جائے گا

(۱) کلیات، ص ۱۱۴، مرتبہ ڈاکٹر محمد ریاض (پاکستان)۔

☆☆ صدر شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد۔

تہذیب اتنی ہی صالح اور مستحکم ہوگی، اس لئے صالحیت حال و مستقبل کی طرح ماضی میں بھی ممکن ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ انسانی خصوصاً تاریخ اسلامی پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے، وہ صرف شاعر اور مورخ نہ تھے بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے بنیاد گذار اور نقاد بھی تھے مشرق و مغرب کے تاریخی سرمایہ پر ان کی تنقید اصول تاریخ کے لئے ایک فاضلانہ اور عالمانہ دستور کا حکم رکھتی ہے۔

قومی یا ملی شعور فطری یا پیدائشی نہیں ہوتا بلکہ وہ کسبی اور اکتسابی ہوتا ہے، شعور کے اس تغیر پذیر عمل سے ہی کسی شاعر کے شعور کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا تاہم ممکن ہے کہ اس بدلتے ہوئے شعور کا تاریخی اور مادی تجزیہ کیا جائے اور شاعر کے تصورات کے متضاد پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے، شبلی کے نزدیک تاریخ کی تدوین اجتماع انسانی کا بنیادی جذبہ ہے کیوں کہ سرمایہ تاریخی قوموں کی ترقی اور زندگی میں ممد ہوتا ہے تاریخ ہی قومی جوش کو زندہ رکھ سکتی ہے اور یہ نہیں تو قوم قوم نہیں (المامون، ج ۱، ص ۴)، سرسید کا قول ہے کہ تاریخ میں صرف واقعات کا ہی ذکر نہ ہو بلکہ . . . . واقعات کے اسباب پر بھی بحث ہو اس میں سوشل اور کلچرل تفصیلات بھی ہوں اور سیاسی تاریخ کے ساتھ علمی اور ذہنی ترقیوں کا حال بھی درج ہو (الفاروق، ج ۱، ص ۱۱) شبلی کی تاریخ نگاری کے بھی یہی اصول ہیں اگرچہ شبلی کا فلسفہ تاریخ سرسید کے مقابلہ میں زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ تاریخ واقعات کے علاوہ انسانی تہذیب و تمدن کی سرگزشت بھی ہے، لہٰذا وہ قدیم تاریخ کو مذاق حال کے مطابق بنانے کے لیے تنقید اور اصول عقلی کے استعمال کو ضروری سمجھتے ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں تاریخی واقعات اور تمدنی جزیات کا ایک مواج سمندر موجزن ہے جو ان کے عمیق مطالعہ ناقدانہ استقصا پر خلوص اور پرشوق محنت کا عکاس ہے چوں کہ انہیں اسلام کے روشن ماضی کی پرعظمت و پرشوکت داستان سے دل چسپی تھی، لہٰذا ان کی نظر تاریخ کے نمایاں ٹکڑوں اور حصوں پر پڑتی ہے اور اپنی شاعری کے ذریعہ تاریخ کے انہیں ٹکڑوں اور لفظوں کو ابھارنا ان کا نصب العین تھا، فرماتے ہیں:

جمع اسلام کہ صیتش بدیار افتاد است　　حالیا باغم و دردش سروکار افتاد است

آن کہ در معرکہ تاج از سر قیصر بہ ربود　　دست و بازوش بیکبار از کار افتاد است

آن کہ صد قلعہ روئین بیکی حملہ گشود	حالیا از ہمہ سو خود بہ حصار افتاد است

(کلیات، ص ۱۹)

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور جدید کے ذہنی اور علمی مذاق و مقتضیات سے کس حد تک آشنا تھے اور قدیم چیزوں کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت کا انہیں کتنا احساس تھا، کہتے ہیں:

حل ایں مشکل اگر خواہی از ندوہ بخواہ	او کشاید گرہی را کہ بکار افتاد است
حکمت و شرع درایں جا بہم آمیختہ اند	نمک و بادہ درایں میکدہ یار افتاد است
در پرسی کہ درین کار چہ تدبیر بود	دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر بود

(کلیات، ص ۲۱)

وہ اسلاف کے قصے، ان کے سپہ گری، ان کے اخلاق و عادات، ان کی شان و شوکت وغیرہ سے شدید طور پر متاثر ہوئے ہیں اور یہی واقعات ان کی انفرادیت اور شاعری میں زور پیدا کرتے ہیں جو ان کے ہم عصروں کے یہاں نہیں، کہتے ہیں:

آنکہ در انجمن فضل نمی داشت ہمال	آنکہ در بزم گہہ دہر نہ بودش انبار
ہیئت و ہندسہ را پایہ از وگشت بلند	منطق و فلسفہ را داد ہم او زیب و طراز
نظم او بنگر و آنگہ سخن از سحر مگوئی	نژاد بیں و دیگر قصہٴ مخوان از اعجاز

(کلیات، ص ۳۱)

انہیں حالات کی تبدیلی کا بھی احساس ہے لیکن وہ حالات سے حیران و پریشان ہو کر خاموش نہیں رہتے بلکہ کہہ اٹھتے ہیں:

ننگ باشد کہ پیش شہ و درویش شویم	ہمت آن است کہ خود چارہ گر خویش شویم
چارہ آن نیست کہ برسم کہن طرح تہی	مکتب و مدرسہ ہا در ہمہ اطراف و بلاد
تا چہ سودت دہد آن شیوہٴ تعلیم قدیم	کہ بہ رویت در رزق نتوانست گشود
بتوانی کہ خود از گوشہ برآئی و انگہ	عرض اسلام کنی در ہمہ امصار و بلاد

(کلیات، ص ۲۰)

بہ قول مولانا سید سلیمان ندوی مولانا کی شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ شروع میں فارسی شعر کہتے تھے، مولانا نے شروع میں ہی جو نظمیں اور قصائد لکھے انہوں نے فارسی کے اہل ذوق میں آگ سی لگادی، ہندوستان میں فارسی شاعری میں نئی شاعری کی بنیاد بلاشبہ مولانا شبلی نے ڈالی اور اس میں نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشہ کی جگہ جیسا کہ اب تک وہ تھی مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے آب حیات بن گئی۔ (حیات شبلی، ۲۲۳)

۱۸۸۵ء میں سب سے پہلے ان کی مثنوی صبح امید شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کی داستان اور علی گڑھ تعلیمی تحریک کا خوش آیند نقشہ پیش کیا ہے، تعجب ہے مولانا نے اس مثنوی کو اپنی کلیات سے خارج کردیا مگر حقیقت یہ ہے کہ شعری محاسن کے لحاظ سے یہ مثنوی قابل تعریف ہے، ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۷ء تک مولانا کا دوسرا شغل شعر و شاعری تھا، تعلیم و تدریس کے علاوہ ان ہی لوگوں میں مولانا کا زیادہ وقت گزرتا، جنہیں شعر و سخن سے دل چسپی تھی، جن میں مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا فیض الحسن اور مولانا محمد فاروق تھے، اس زمانے میں مولانا شبلی عموماً فارسی غزلیں اور قصائد لکھتے، ۲۷/مارچ ۱۸۸۴ء کو اپنے استاد مولانا محمد فاروق صاحب سے درخواست کی کہ ان کے فارسی کلام کو دیکھ لیں کیوں کہ پریس میں جائے گا، اسی تاریخ کے ایک خط میں ایک فارسی واسوخت لکھ جانے کی خبر دی، فرماتے ہیں قابل دید ہے خود اپنی زبان سے سناؤں گا، ۲۴/اپریل ۱۸۸۴ء کے خط میں فرماتے ہیں، واسوخت فارسی کے پندرہ بند یعنی ۴۵ شعر پر مشتمل ہے۔ (حیات شبلی، ص ۱۲۹)

رفتہ رفتہ مولانا کے شعر و سخن کا چرچا بڑھا، انہیں دنوں اپریل ۱۸۸۴ء میں حیران و فراوان کے قافیہ اور چہ کنم کی ردیف میں علی حزیں کی غزل پر غزل لکھی، علامہ شبلی علی گڑھ میں ایسی آب و ہوا میں تھے، جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات اور دور جدید کے نئے انقلابات گرد و پیش تھے، ان اثرات و جذبات کی نیرنگیوں میں حق و باطل کی آمیزش اس طرح تھی کہ انہیں جدا کرنے کے لیے غیر معمولی بصیرت درکار تھی جو مولانا میں موجود تھی، بہ قول مولانا سید سلیمان ندوی ''بہرحال علی گڑھ کے بعض مفید اثرات کو مولانا نے جلد قبول کیا، ان میں سب سے پہلی چیز

ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے، ان کے دور نگین ترانے جواب تک حسن وعشق کی جھوٹی کتابوں سے لبریز تھے، اب قوم وملت کے عشق سے خون افشاں ہونے لگے، مسلمان کیا تھے اور کیا ہوگئے، یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا، اسی سال ۱۸۸۳ء میں جو عید آئی وہ ان کو خون کے آنسو رلا گئی، ایک قصیدہ ''عیدیہ'' لکھا جس میں عید کی آمد کی خوشی، سامان اور دوگانہ عید کی کیفیت کے بعد ملت کے درد پر جو آنسو بہائے ہیں، ان کے چند قطرے یہ ہیں:

حیف کیں شور وطرب یک دو نفس بیش نماند — چہ کند عید بدروی کہ بود صبر گداز
جمع اسلام چو باشد ہدف تیر بلا — خود چو کج باخت بہ ایشاں فلک عربدہ ساز
فرق نبود بحقیقت ز محرم تا عید — آہ از فتنہ گری ہای سپہر کج باز
خود ہماں جمع کہ می داشت بہم تیغ وقلم — خود ہماں قوم کہ بودہ است بہر پایہ فراز
لیک آں قوم بحالیست کہ نتواں گفتن — خود بہ بیں تا بچہ انجام رسید آں آغاز
شرح ایں حادثہ از شبلی دل خستہ مخواہ — شب بود کوتہ و افسانہ دراز است دراز

(حیات شبلی، ص ۱۳۲)

شبلی چاہتے تھے کہ اسلامی علوم وفنون اور تاریخ وتمدن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے لایا جائے تاکہ اسلام کی تاریخی وتمدنی عظمت اور علمی جلالت سب کے سامنے آجائے، جس سے قوم کے افسردہ دلوں میں از سر نو تازگی اور امنگ بھی پیدا ہو اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات کی بے مائگی کا بھی اندازہ ہو۔ (حیات شبلی، ص ۱۷)

غرض کہ شبلی اپنے مقصد میں تا حدے کامیاب ہوئے اور انہوں نے اپنی شاعری اور نگارشات سے جدید تعلیم یافتہ گروہ کو بے حد متاثر کیا، چنانچہ خود شبلی لکھتے ہیں ''مجھ کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا کرنے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کو برانگیختہ کرنا میری قسمت میں تھا'' (مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۵)، شبلی کی سیاست پسندی کے واقعات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگرچہ سیاسیات ان کے قلم کا موضوع نہ تھا تاہم سیاسیات کے ہمیشہ دلدادہ رہے، کیوں کہ حقیقت میں یہ ان کی شاعری کی وسعت کا ایک جزو تھا، یعنی انہیں اسلام اور اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون سے جو شغف تھا، اس کا یہ فطری تقاضا تھا کیوں کہ

جب انہوں نے دیکھا کہ

بزم را دید کہ از نغمہ دوشینہ تہی است — شبلی آں زمزمہ را باز ز آغاز گرفت

(کلیات، ص ۱۰۱)

اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بھی یہ خیال تھا کہ قدیم محض قدیم ہونے کی وجہ سے بقا کا مستحق نہیں قرار پاتا بلکہ تہذیبی، تمدنی اور ملی تاریخ پر روشنی ڈالنے اور ہر دور میں انسان کی آزادی اور ترقی کی خواہش کو نمایاں کرنے کی جدوجہد کا آئینہ ہونے کے سبب سے ہی شعر تہذیبی ارتقا کا جزو بننے کا حق حاصل کرسکتا ہے جو شاعری اپنے دور کی مرکزی کشمکش کا عکس نہیں پیش کرتی وہ نہ تو تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور نہ ادبی، اسی کسوٹی پر پورا اترنے کے بعد وہ ماضی، حال اور مستقبل کے لیے سبق آموز سرمایہ بن سکتی ہے، مندرجہ بالا واقعات اور نکات کی روشنی میں جب ہم شبلی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو بہ قول مولانا سید سلیمان ندوی ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شبلی نے ۳۲ سال ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب اور اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پر شور رکھا۔

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود — زیں نواہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ است

(حیات شبلی، ص ۱)

اس میں شک نہیں کہ شاعر کا ملی اور قومی رجحان اس کے فلسفہ حیات کی نشان دہی کرتا ہے لیکن محض یہ دیکھنا کہ شاعر کس قوم یا سماج کے کس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، کافی نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے زندگی کی کشمکش کو سمجھنے میں اپنے ذہنی شعور کی توسیع کس طرح کی ہے اور عصری مسائل کے سمجھنے کے سلسلے میں اس کا کیا رویہ رہا کیوں کہ ان مسائل کے حل کی کوشش سماج کے مفاد کی ترجمان اور اس کے بقا کی جدوجہد ہی ملی اور قومی شعور کی سطح کو متعین کرتا ہے، بہ قول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ''(مولانا) شبلی نعمانی فارسی کے خوش فکر شاعر تھے، انہوں نے جہاں ایک طرف کسی تاریخی واقعہ کو شاعرانہ انداز میں نظم کیا ہے، وہیں ان کے عصر کے مسائل پر لکھی گئی، لمحاتی شاعری بھی کی ہے، قومی اور ملی نظمیں ان کے سیاسی شعور اور عصری آگہی کی ترجمان ہیں''۔ (الفاروق ایک مطالعہ، ص ۳۸۴)

غرض کہ علامہ شبلی کی شاعری درج ذیل خصوصیات ونکات کی حامل ہے:

۱- مولانا شبلی زمانہ کے عام وخاص واقعات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، وہ ان واقعات سے حقائق ونتائج تاریخی کا استخراج کرتے ہیں اور واقعات کو عقائد کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی نگاہ میں اسلامی تہذیب کا عہد ماضی انسانی تہذیب وتمدن کا بہترین دور تھا، انہیں یقین ہے کہ اگر آیندہ بھی انسانی تہذیب ترقی کی منزلوں تک پہنچنا چاہتی ہے تو اسے لوٹ کر ماضی کی طرف جانا پڑے گا۔

۲- مولانا شبلی کے کلام کی نمایاں خصوصیت قوت اور جوش بیان ہے جو ان کے احساس کمال اور احساس عظمت کی نمایاں پیداوار ہے جسے وہ کبھی خطیبانہ کبھی واعظانہ کبھی مدرسانہ اور فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں، انہیں اپنے زمانے کی جہالت اور بدمذاقی کا پورا یقین تھا جسے ہم ان کی خودنظری اور احساس کمال کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں اور غالباً اسی اعتماد کی بہ دولت ان کی شاعری میں تاثیر اور صمیمیت پائی جاتی ہے، داخلی معنویت کی طرح ظاہری منطقی انداز نظم بھی موجود ہے، جس کی وجہ سے ان کے اشعار چست ودرست اور فکری نظم وضبط کے لحاظ سے تعمیر کے عمدہ نمونے ہیں، اسی علمی اور منطقی عنصر نے ان کی شاعری کو پر رعب اور باوقار بنادیا ہے۔

۳- مولانا شبلی کے اشعار کی دوسری خصوصیت ایجاز واختصار ہے، ان کے اشعار میں جو لطف اور جوش ہے، اس کا بڑا سبب یہی ایجاز واختصار ہے اور اپنے کلام میں یہ کیفیت پیدا کرنے کے لیے وہ کئی طریقے اپناتے ہیں، جن میں سب سے اہم تلمیحات واستعارات ہیں مگر ان میں بھی وہ ان تصاویر اور ان معانی کے دلدادہ ہیں جن میں زندگی کی شوخ شدید مفرط اور انتہائی کیفیتیں پائی جاتی ہیں، بہ قول سید عبداللہ شبلی نے تشبیہ واستعارہ کو کچھ ایسے طریق سے پیش کیا ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں کو بیان سے جدا کوئی الگ چیز تصور کرتے ہیں یعنی ان کو اضافی اور خارجی محاسن کلام میں سے کچھ سمجھتے ہیں، بیان واظہار کا جزو ہیں"۔ (سرسید کے نامور رفقا، ص ۲۱۰)

۴- مولانا شبلی کے کلام میں کہیں کہیں انیسویں اور بیسویں صدی کے مخصوص علمی نظریات اور افکار کا خاص اثر نمایاں ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کے بعض

رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔

۵- ان کے بیشتر اشعار عزت نفس، خودداری، آزادی اور حق گوئی کی نشان دہی کرتے ہیں اور یہی صفات اس دور کے لیے درکار تھیں، ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری سے انقلاب، آزادی اور حریت کا پیغام دینا چاہتے تھے۔

۶- مولانا شبلی فارسی کی رنگین تراکیب کو نہایت خوبصورت اور عمدہ انداز سے پیش کرتے ہیں جس سے ان کے اشعار کی خوبصورتی اور دلآویزی دوچند ہوجاتی ہے، بہ قول سید عبداللہ شبلی فارسی کی رنگین تراکیب کو بڑی خوبصورتی سے باہم پیوست کرتے ہیں جس سے ان کے اشعار میں چستی اور چمک پیدا ہوجاتی ہے، ان کے اشعار کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں وہ عناصر زیادہ ہیں جو غزل سے مخصوص ہیں، ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی اور زمانے اور ماحول میں ہوتے تو شاید دوسرے غالب یا دوسرے نظیری ہوتے، ان کے اشعار میں ایمائیت، ایجاز اور اجمال کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ (سرسید اور ان کے نامور رفقا، ص ۱۸۷)

۷- ان کی تراکیب زیادہ تر ہندوستان کے تازہ گویوں کے کلام سے مشابہ ہیں، ان میں شراب وشباب، بہار وموسم، مستی وبےخودی، رنگینی ورعنائی کے تصورات پائے جاتے ہیں۔

۸- ان کے اشعار عام طور پر سادہ ہوتے ہیں لیکن سادگی کے باوجود ان میں حسن کاری پائی جاتی ہے جو صوتی اعتبار سے انہیں اثر کا حسن اور لطف کا ایک نادر مجموعہ بنادیتی ہے، ان کے اشعار میں بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے، جو مدعا اور مضمون کے اقتضا سے خود بخود ایک خاص قسم کا آہنگ اور صوتی فضا پیدا کردیتی ہے، یہ درست ہے کہ سادہ نگاری عوام کو پسند نہیں لیکن بہ قول خود علامہ شبلی "روحانی اوصاف کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ طرز زندگی جس قدر سادہ اور آسان ہے، دراصل اسی قدر مشکل اور قدر کے قابل"۔ (سیرۃ النعمان، ج ۱، ص ۶۹)

۹- پرجوش خیالات کے اظہار میں ان کے اشعار میں ایک مخصوص موسیقی پیدا ہوجاتی ہے جو اشعار کے مدوجزر میں خوش گوار لے کو ابھارتی ہے اور اشعار میں اصوات کے الگ الگ فردے یکے بعد دیگرے بھی ابھرتے ہیں اور اشعار میں جوش پیدا کردیتے ہیں۔

۱۰- شبلی کے اشعار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ سیدھے سادے اور بے تکلف

خیالات ہوتے ہیں جس مضمون کو چاہتے ہیں، بے تکلف ادا کر دیتے ہیں، بہ قول سید عبداللہ ''ان کے اسلوب بیان کا ایک وصف بے ساختگی بھی ہے، ان کا انداز بیان قدرتی اور بے ساختہ ہوتا ہے، ان کے اشعار حسین سانچوں میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں ادائیگی ایسی ہوتی ہے کہ تکلف اور اہتمام بالکل نہیں ہوتا، ان کے اشعار میں بے جا اہتمام شاید تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گا اور طرہ یہ ہے کہ ان میں کامل بے ساختگی کے باوجود تخیل کا ایک خاص انداز اور حسن کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے، شبلی کی حسن کاری بے عیب ہے''۔ (سرسید اور ان کے نامور رفقا، ص ۱۹۱-۱۹۰)

شبلی کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری اور آرٹ کو فطرت کا ترجمان نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک اعلا شاعری اور آرٹ کا نصب العین یہ ہے کہ وہ فطرت کی تکمیل کرے اور حسن کے اعلا مثالی اور معیاری پیکروں کی مصوری بھی کرے۔

شبلی کے تاریخی نظریات میں بھی اس خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ طبعی اور جغرافیائی اثرات انسانی تاریخ کے مدوجزر میں اہم رول ادا کرتے ہیں، اسی لیے ان کی شاعری میں ماحول کے اثرات کو واقعات واحوال کے لیے نہایت موثر مانا گیا ہے۔

ان کی منظر نگاری ان کی بیانیہ نگاری سے بہتر ہوتی ہے، مناظر کی تصویر کشی کے وقت ان کا ذہن نسبتاً پر سکون نظر آتا ہے، بہ قول مولانا سید سلیمان ندوی ''شبلی اپنی نظمیں نہایت دل کش اور بے حد موثر انداز میں پڑھتے تھے، سفر قسطنطنیہ کے حالات پر مشتمل ایک فارسی قصیدہ سفر نامہ اور کلیات دونوں میں شامل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مناظر کی خوش آیند دل چسپی نے شبلی کے دل میں ایک خاص کیفیت پیدا کی تھی''، (حیات شبلی، ص ۱۹۳-۱۹۲) ایک جگہ مسلمانوں کے انگریزی داں طبقہ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''مسلمانوں نے صرف طرز معاشرت ہی انگریزوں سے نہیں لی بلکہ انگریزیت اس درجہ ان کے ذہن پر طاری ہو چکی ہے کہ اگر ان کے سامنے:

نکتہ شرع بہ افسانہ برابر بہ تہی
یوروپ ار گپ زند آن نیز مسلم باشد

(کلیات، ص ۲۴)

جس طرح ان کے یہاں پیغام کی اہمیت رہتی ہے، اسی طرح وہ شاعری میں ایک

خاص اخلاقی روح کے متلاشی رہتے ہیں جو صرف اجتماع انسانی کی تعمیر و تکمیل ہی نہ ہو بلکہ اعلا انسانی اقدار و فضائل کی ابھارنے والی ہو، بہ قول سید عبداللہ ''شبلی کے نزدیک ترقی اور صالحیت جذبات صالحہ پر منحصر ہے، یہ جذبات صالح جب بھی پیدا ہو جائیں اور جب تک زندہ رہیں ترقی اور صالحیت زندہ رہتی ہے، قوموں کے مرجانے کے بعد ترقی اور صالحیت باقی رہتی ہے، قوموں کے مرجانے کے بعد ترقی اور صالحیت پھر بھی زندہ ہو سکتی ہے، بشرطیکہ مستقبل کی تعمیر کے لیے ماضی کے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے''۔ (سرسید اور ان کے نامور رفقا، ص ۱۷۴)

مختصر یہ کہ شبلی نے مندرجہ بالا عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے جن رجحانات کی ہمت افزائی کی وہ بہ قول سید عبداللہ ''یہ ہے کہ علما کی اندرونی خرابیوں کی اصلاح، حکام اور سلاطین کے سامنے آزادی اور حق گوئی کی ہمت، فلسفہ و عقلیات کے مطالعہ کی اہمیت، تمدن اور سوسائٹی کی تہذیب کی ضرورت اجتہاد اور آزادی رائے کی اہمیت یوروپ کی علمی خدمات اور علمائے یوروپ کا تعصب مسلمانوں کے متعلق وغیرہ وغیرہ''۔ (سرسید اور ان کے نامور رفقا، ص ۱۴۶)

البتہ آخری زمانے میں شبلی کی فارسی غزلوں میں حافظ کا اثر تیز تر ہوتا گیا، جس کے باعث بعض ناقدین نے لکھا ہے کہ مولانا پر تصوف کا غلبہ ہو رہا ہے اور انہیں تلاش ہوئی کہ اس شراب حقیقت کا پیر مغاں کون ہے مگر یہ حقیقت نہ تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ فلسفہ و حکمت کا نشہ ان کے سر سے اتر چکا تھا اور وہ کہنے لگے تھے کہ:

دو دل بودن درایں رہ سخت تر عیب است سالک را
خجل بستم ز کفر خود کہ دارد بوئی ایمان ہم

ساغر زندگیم حیف کہ جز درد نداشت
جز ہمین جرعۂ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام

(کلیات، ص ۱۴۲، ۱۳۷)

مختصر یہ کہ شبلی کا شعری ذوق و وجدان نہایت پختہ اور مکمل ہے، ان کے اشعار کے سیاسی، اجتماعی، مذہبی، جمالیاتی اور رنگینی مزاج کے عکاس ہیں اور حقیقتاً شبلی کی شاعری اور شبلی کی شخصیت ایسی ہے کہ اگر کہا جائے کہ

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ما گشاد

تو نہ کوئی مبالغہ ہوگا اور نہ کوئی بیجا بات۔

☆☆☆☆☆

کوئی دوسرا مشفق نہیں ہے

از:- ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ☆

انسان اپنی خلقت اور سرشت میں گوناگوں آرزوؤں، خواہشوں اور تمناؤں کا مرقع ہے اور اس کی پوری زندگی ان ہی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل وتزئین میں گزر جاتی ہے، خاک کا یہ پتلا بالعموم خواہشات نفس کا اسیر رہتا ہے اور حیات مستعار کی پوری نقدی کھیل تماشوں میں صرف کردیتا ہے، زر و مال کی طلب اور اس کی محبت نفس خواہشیں، نام ونمود اور شہرت کی تمنا، جاہ ومنصب کی حرص اور مجموعی طور پر ایک خوش حال اور مال ومتاع سے پر، ایک اونچے "معیار زندگی" کے لیے جد وجہد بیشتر انسانوں کو ایک کرب مسلسل میں مبتلا رکھتی ہے، یہی وہ اسلوب حیات (Life Style) ہے جسے قرآن حکیم میں "خُسران" سے تعبیر کیا گیا ہے (اِنَّ الاِنسَانَ لَفِی خُسرٍ)

خوش بخت ہیں وہ معدودے چند لوگ جو خواہشات نفس کے اس طغیان سے بچ بچا کر صحیح سلامت ساحل تک پہنچ جاتے ہیں، جناب مشفق خواجہ جنہیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، ایسے ہی معدودے چند لوگوں میں شامل تھے، (یہیں سمجھ میں آتا ہے کہ "کلیجہ منہ کو آنا" کسے کہتے ہیں، اور اس میں کتنا رنج وغم، کتنا ہجر وفراق اور کتنی محرومی پوشیدہ ہے)

خواجہ صاحب ایک مہذب، مستغنی اور شایستہ انسان تھے، انہوں نے اس درجہ اپنی تہذیب نفس کرلی تھی کہ وہ ہر طرح سے نام ونمود، جاہ ومنصب اور مال ومنال کی ہر خواہش سے بے نیاز ہوچکے تھے، علامہ اقبال کا یہ مصرع ان پر صادق آتا ہے:

ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

ادب کی دنیا میں اعتراف (recognition) آج کے ادیب اور شاعر کا سب سے بڑا

☆ سابق صدر شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور۔

مسئلہ ہے اور ہم سب الا ماشاء اللہ اسی انسانی کمزوری کا شکار ہیں، جو کچھ ہم لکھتے ہیں، اس پر ہمیں داد ملنی چاہیے اگر کتاب چھپے (اور کیوں نہ چھپے بلکہ اگر ہر سال ایک نئی کتاب چھپے تو کیا خوب ہے!) فلیپ پر تعریفی کلمات، ایک تحسینی دیباچہ، چند توصیفی تقریظیں - پھر اخبارات ورسائل میں کچھ تبصرے - ایک دو شہروں میں بلکہ اگر ہوسکے تو بیرون ملک اردو کی نئی بستیوں میں تقریبات اجرائی ورونمائی، صاحب کتاب کے بارے میں کسی ادبی رسالے کا خاص نمبر یا گوشہ ہی سہی، اگر صاحب کتاب شاعر ہیں تو ان کا بلند پایہ کلام ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر بھی ہونا چاہیے، اب صاحب کتاب کو اس کتاب پر کوئی ادبی ایوارڈ بھی ملے اور "صدارتی تمغائے حسن کارکردگی" کی خواہش تو بالکل فطری ہے، مشفق خواجہ ان سب باتوں سے بے نیاز تھے۔

ہماری بعض جامعات میں زندہ شخصیات ادب پر سندی مقالے لکھوانے کی روایت موجود ہے، خواجہ ہر اعتبار سے اس کا استحقاق رکھتے تھے کہ ان کے علمی وادبی کارنامے کو موضوع مقالہ بنایا جائے، مگر وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان پر کچھ لکھا جائے باوجود اس کے کہ، علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کے وہ قدر دان تھے اور کام کرنے والوں کی ممکنہ حد تک اور خوش دلی کے ساتھ مدد کرتے، اپنے معاملے میں وہ کسی طرح کا تعاون کرنے سے صاف انکار کردیتے تھے، میرے علم میں ہے کہ پروفیسر تحسین فراقی صاحب نے اپنے ایک شاگرد حافظ محمد قاسم (متعلم ایم اے اردو، اورینٹل کالج لاہور) کے تحقیقی مقالے کا موضوع تجویز کیا، "مشفق خواجہ بہ طور مدون" جب خواجہ صاحب تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فراقی صاحب سے بھی خفا ہوئے، فراقی صاحب نے تو یہ موضوع میرٹ پر تجویز کیا تھا، خواجہ صاحب بہر حال اس کا استحقاق رکھتے تھے، مگر خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ لوگ اسے "حق دوستی" پر محمول کریں گے، (یہ معلوم ہے کہ خواجہ صاحب فراقی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اس مقالے کے نگراں اورنگ زیب عالم گیر صاحب سے بھی خواجہ صاحب کو خاص تعلق خاطر تھا)، بایں ہمہ مقالہ نگار نے اپنا کام جاری رکھا۔

ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر صاحب نے خواجہ صاحب کے برادر بزرگ خواجہ عبدالقیوم اور بعض دیگر عزیزوں سے رابطہ قائم کیا تا کہ مقالے کے باب اول کے لیے خواجہ صاحب کے کچھ سوانحی حالات معلوم کیے جائیں، خواجہ عبدالقیوم صاحب اپنے چھوٹے بھائی کے مزاج سے واقف

تھے، اس لیے انہوں نے ازراہ احتیاط معلومات فراہم کرنے سے پہلے مشفق خواجہ صاحب سے بات کی تو انہوں نے منع کردیا، چنانچہ عالم گیر صاحب مقالہ نگار کو خواجہ صاحب کے سوانحی اور شخصی حالات کے ضمن میں کوئی نئی بات یا مزید معلومات نہ مل سکیں، مقالہ بہرحال مکمل ہوگیا، طالب علم کو ڈگری بھی مل گئی، کچھ عرصے کے بعد شعبہ اردو کے مجلّہ ''بازیافت'' (مدیر: تحسین فراقی) میں ''کلیات یگانہ'' پر مذکورہ طالب علم کا تبصرہ شائع ہوا تو خواجہ صاحب نے پھر تحسین صاحب سے خفگی کا اظہار کیا، فی الحقیقت وہ خلوص دل سے سمجھتے تھے کہ عالم اور شاعر و ادیب کے لیے شہرت اور نام و نمود مہلک ہے، ایک بار راقم الحروف کو خط میں لکھا: ''ہوس، دولت و شہرت کی ہو، نفس امارہ کی یا کتابوں کی، اس کی کوئی انتہا نہیں، الحمدللہ میں ہر معاملے میں قناعت پسند ہوں''۔

ڈاکٹر طاہر مسعود کی روایت ہے: ''وہ مجھ سے کہا کرتے تھے، آدمی اپنے کام سے پہچانا جاتا ہے، لہٰذا اصل اہمیت کام کی ہے، نام میں کیا رکھا ہے، شیطان سے زیادہ مشہور کون ہوگا، آپ کتنی ہی کوشش کرلیجیے شیطان سے زیادہ مشہور تو نہیں ہوسکتے''۔ (قومی زبان، کراچی، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۲۳)

مشفق خواجہ کی شخصیت کا ایک نہایت لائق تحسین پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے نیازمندوں، اساتذہ اور باصلاحیت طلبہ کو علمی و ادبی، تحقیقی و تنقیدی سرگرمیوں کے لیے آمادہ و تیار کرتے، کام کے موضوعات تجویز کرتے، جو جس لائق ہوتا اسے ویسا ہی کام تجویز کرکے سونپ دیتے، کسی کتاب یا مخطوطے کی تدوین کا فیصلہ ہوتا تو خود فوٹو کاپی بنوادیتے، متعلقہ موضوع پر جس قدر لوازمہ اور مواد ان کی دسترس میں ہوتا، بلاتامل مہیا کرتے اور جو چیز ان کے پاس نہ ہوتی، اس کی نشان دہی کردیتے، راقم اپنی فہم و دانست کے مطابق کسی نہ کسی علمی کام میں مصروف رہتے مگر جب بھی خواجہ صاحب سے ملاقات ہوتی تو وہ میرے لیے تدوین کا کوئی کام تجویز کردیتے، ایک بار انہوں نے مجھے کا(۱) دیوان فوٹو کرا کے بھیج دیا کہ اسے مدون کرو، میں نے معذرت کی، یہ کام میرے بس کا نہیں ہے کیوں کہ مجھے عروض میں مہارت حاصل نہیں اور اس کے بغیر شاعری کی تدوین ناقص ہوگی، انہوں نے اس سے اتفاق کیا، اب انہوں نے عبدالرزاق کان پوری کی ''یادایام'' کا عکس

---

(۱) کذا؟ مقالہ نگار نے صاحب دیوان کا نام نہیں لکھا۔

بھیج دیا اور ساتھ ہی تدوین اور املا تک کے لیے ہدایات بھی لکھ بھیجیں، اسی طرح خواجہ صاحب نے تحسین فراقی صاحب کے لیے کئی علمی کام تجویز کیے، ان میں سے کچھ پایہ تکمیل کو پہنچے، جیسے ''عجائبات فرنگ'' کی تدوین یا مقالہ ''اردو تنقید کے دس سال'' اور کچھ ناتمام رہ گئے جیسے ''مسیر طالبی'' کا ترجمہ یا ''عبرت الغافلین'' کی تدوین وغیرہ۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب سے انہوں نے ''گلشن ہمیشہ بہار'' مرتب کرایا، ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر صاحب کو وہ خواجہ محمد شفیع دہلوی کی آپ بیتی ریکارڈ کرنے پر اکساتے رہے، انہیں ایک خط میں لکھا: ''یہ کام بہت اہم ہے، اسے آپ دوسرے تمام کاموں پر ترجیح دیجیے، کسی نشست میں ان کے خاندانی حالات ٹیپ کرلیجیے، کسی میں دہلی کی ثقافتی زندگی کی تفصیلات، خواجہ صاحب کا وسیع حلقہ ارباب تھا، پہلے ان کے نام پوچھ لیجیے، پھر فرداً فرداً ہر ایک کی شخصیت کے بارے میں ان کے تاثرات، خواجہ صاحب نے ۴۷ء کا زمانہ نہایت پریشان کن حالات میں گزارا تھا، ہجرت کے حالات تفصیل سے پوچھیے، بمبئی میں فلمی دنیا کے حالات تو وہ خود ہی مزے سے لے لے کر بیان کریں گے، غرض کہ بات سے بات نکلتی آئے گی''۔ (۶/جون ۱۹۸۶ء)

مقتدرہ قومی زبان نے ڈاکٹر جمیل جالبی کے زمانہ صدرنشینی میں ''قومی انگریزی اردو لغت'' شائع کی تھی، دوسرا منصوبہ ''قومی اردو انگریزی لغت'' کا تھا، جس کے مدیر اعلا جناب مظفر علی سید مقرر ہوئے تھے، اس سلسلے میں خواجہ صاحب نے انتخاب الفاظ کا کام ڈاکٹر عالم گیر صاحب سے کرایا تھا (آخر میں کچھ شمولیت محمد احسن خاں صاحب نے بھی کی)، مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی کیوں کہ اردو سے انگریزی ترجمے کا کام جن اصحاب کے سپرد کیا گیا، انہوں نے تھوڑا تھوڑا کام کرنے کے بعد اس بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیا۔

خواجہ صاحب ایک بے لوث، بے غرض اور نیک نفس انسان تھے، علمی و ادبی منصوبے تیار کرنا اور ایسے منصوبوں میں مصروف تحقیق کاروں اور عالموں کی فراخ دلی سے مدد و اعانت کرنا ان کا شیوہ تھا، اپنی اس خوبی کی وجہ سے وہ ادبی دنیا کے تمام گروہوں، دھڑوں اور حلقوں میں یکساں طور پر مقبول تھے، اِکّا دُکّا بر خود غلط قلم کاروں کو چھوڑ کر وہ ہر ایک کی ضرورت تھے، دوست دشمن (اگرچہ وہ کسی کو اپنا دشمن خیال نہیں کرتے تھے، ہاں، کسی نے خود کو ان کا ''دشمن'' فرض کرلیا

ہو تو اس کی قسمت) ہر ایک کو ان کا تعاون میسر رہتا اور یہ کام، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، وہ کسی دنیاوی غرض کے لیے نہیں کرتے تھے، کیوں کہ ان کے بہ قول ''نیکی کا اجر خدا ہی دے سکتا ہے، بندے کے بس کی بات نہیں''۔ (مکتوب بنام اورنگ زیب عالم گیر، ۶ر دسمبر ۱۹۹۷ء)

علم و ادب کا ایسا پرخلوص اور بے لوث خدمت گزار، اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا، شاید ہمیں اندازہ نہیں کہ طاہر مسعود کے بہ قول ''کیسا قیمتی اور نادر روزگار آدمی ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے''۔ (قومی زبان، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۲۵)

مشفق خواجہ خود ایک باکمال، کھرے ادیب، مزاح نگار، شاعر اور محقق تھے، تخلیق اور تحقیق دونوں میں انہوں نے قدر اول کی چیزیں یادگار چھوڑی ہیں، ہمارے لیے ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں میں کیا سبق پوشیدہ ہے؟ یہ کہ ستائش کی تمنا کی پروا کیے بغیر اپنا کام محنت اور کاوش اور دیانت داری کے ساتھ کیے چلے جاؤ، عزت، احترام، محبت اور شہرت بھی اگر حاصل ہوگی تو کام ہی کی بہ دولت حاصل ہوگی۔

ان کی شخصیت کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ اسلام، پاکستان اور اقبال کے ساتھ ایک غیر متزلزل وابستگی رکھتے تھے اور یہ وابستگی انہیں اپنے والد خواجہ عبدالوحید سے ورثے میں ملی تھی، وہ اپنے مخصوص شگفتہ اسلوب میں اشتراکیت، اباحیت، الحاد، آمریت پر تنقید کرتے، علمی و ادبی دنیا میں جعل سازی اور بناوٹی رویوں پر خوب خوب چوٹ کرتے اور شہرت کی ہوس میں مبتلا اہل قلم پر اپنے مخصوص انداز میں کچھ ایسی لطیف طنز کرتے کہ مخالف بلبلا اٹھتا مگر لطف بھی لیتا، یہی وہ خوبی تھی جس کی بنا پر نہ صرف پاکستان کے تمام ادبی حلقوں بلکہ بھارت میں بھی مقبول تھا اور وہاں کے متعدد رسالوں اور اخباروں میں نقل کیا جاتا تھا، خامہ بگوش کی کالم نگاری میں وقفے بھی آتے رہے، چنانچہ ان کا تازہ کالم میسر نہ آتا تو بعض رسائل، اپنے قارئین کے تفنن طبع کے لیے پرانے کالم ہی شائع کرتے رہتے تھے۔

۲۱ر فروری ۲۰۰۵ء کو مشفق خواجہ کی وفات پر راقم الحروف نے (''نوائے وقت'' کے لیے) اپنے فوری تاثر کا اظہار اس طرح کیا تھا:

''مشفق خواجہ کی رحلت موجودہ صدی میں پاکستان کی علمی و ادبی اور تحقیق و تنقید کی دنیا کا سب

سے بڑا سانحہ ہے، وہ ایک ایسی جامع الصفات ادبی شخصیت تھے، جس کی کوئی مثال، اردو کی معاصر ادبی دنیا میں نہیں ملتی، میرے ایک مرحوم دوست کو یہ ماننے میں تامل ہوا مگر آج ایک برس بعد بھی مجھے اپنے اس تاثر میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اس ایک برس میں مشفق خواجہ پر بہت کچھ لکھا گیا اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے مگر نہیں کہا جاسکتا کہ اس پیکر خلوص و دانش کی شخصیت کے سارے پہلو ہمارے سامنے آگئے ہیں یا اس کی علمی و ادبی مہارت، دنیائے علم و تحقیق کے سامنے پوری طرح منکشف ہوگئی ہے۔

اس عرصے میں جس سے بھی ملاقات ہوئی، جہاں بھی مشفق خواجہ کا ذکر آیا اور جو کچھ ان پر چھپا، ایک دو حضرات کے سوا سب کو ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان پایا، وہ انسان تھے، ان میں کمزوریاں بھی تھیں مگر بہ قول جمیل الدین عالی ''ان کی خوبیاں، ان کی کمزوریوں کے مقابلے میں کئی ہزار گنا زیادہ تھیں''۔ (قومی زبان، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۰)

میں دعا گو ہوں کہ خدا ان کی کمزوریوں، عمل کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف کرے، ان کی مغفرت کرے اور ان کے درجات بلند کرے، آمین۔

مشفق خواجہ اول و آخر اور سرتاپا ایک علم دوست شخص تھے، علم و ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، ان سے مل کر، ان کے پاس بیٹھ کر، ان کی باتیں کرکے اور ان سے تبادلہ خیال کرکے اندازہ ہوتا تھا کہ ''علم و ادب بہ طور اوڑھنا بچھونا'' کیا مفہوم رکھتا ہے؟ راقم کو ان سے بارہا ملنے اور ان کی صحبت میں کئی کئی گھنٹے گزارنے کا موقع ملا، بلکہ دو ایک بار تو ناظم آباد کراچی میں، ان کے ہاں چند دن مقیم رہنے کا موقع بھی ملا، میں تو دن بھر ان کے کتب خانے کی سیر کرتا، کتابیں دیکھتا، نوٹس لیتا اور شام کو ہم روزانہ لمبی سیر کرتے، کسی جگہ کھانا کھاتے اور دنیا جہاں کی باتیں کرتے، لیکن ہر ملاقات یا صحبت کے اختتام پر تشنگی باقی رہتی اور یہ خواہش بھی کہ کچھ اور موقع ملے، باتیں ہوں، کچھ اور استفادہ کیا جائے۔

خوش بخت ہیں کراچی کے وہ ادیب، شاعر، دانش ور اور اہل قلم جو مشفق خواجہ جیسی نعمت سے مستفیض ہوتے رہے، اب وہ اس نعمت سے محروم ہوگئے ہیں لیکن یہ محرومی صرف کراچی والوں کی نہیں ہے پوری اردو دنیا اور دنیائے علم و ادب کی محرومی ہے۔

مرحوم ''اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں''، یہ ایک روایتی جملہ ہے لیکن یہ جملہ اگر کسی پر صادق آتا ہے تو مشفق خواجہ پر، انہوں نے اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود تن تنہا ایسے بلند پایہ اور معیاری و مثالی تحقیقی کام انجام دیے جو اداروں کے کرنے کے تھے، اس کے باوجود یہ ایک سفاک حقیقت ہے کہ کار دنیا کسے تمام نہ کرد، ابھی کتنے ہی کام مشفق خواجہ کے پیش نظر تھے، جو وہ انجام دینا چاہتے تھے، مکمل کرنا چاہتے تھے، بسے گفتنیہا کہ ناگفتہ ماند، مرحوم اس آرزوئے ناتمام کے ساتھ عالم جاودانی کو رخصت ہوئے ہوں گے کہ کچھ اور مہلت ملے تو اپنے علمی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچادوں، مگر بے نام اللہ کا، ان کی بہت سی تحریریں، بہت سے مضامین، بہت سے تبصرے غیر مدون ہیں، یہ سب کئی جلدوں میں سمائیں گے۔

مشفق خواجہ کی شخصیت اور ان کی علمی نہاد و افتاد طبع کو سمجھنے کے لیے ان کے مکاتیب ایک بڑا قیمتی اور اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، جناب محمد عالم مختار حق نے اپنے نام مرحوم کے خطوط حواشی کے ساتھ مرتب کردیے ہیں، یہ کتاب بہت جلد آنے والی ہے، راقم کے نام مکاتیب مشفق خواجہ کا مجموعہ بھی تیار ہے، چند خطوط ''مخزن'' میں چھپے ہیں اور ایک بڑی تعداد ''الزبیر'' اور ''مکالمہ'' میں آنے والی ہے، جو اصحاب مشفق خواجہ سے قربت و محبت اور ''باما آشنا بود'' کا دعوی رکھتے ہیں، اس محبت و تعلق کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے نام مرحوم کے خطوط مختصر توضیحات کے ساتھ شائع کردیں اور اس کار خیر میں تاخیر نہ کریں، رہا ان کی تحریروں کی تدوین کا کام یا ان کے ناتمام علمی و ادبی منصوبوں کی تکمیل تو وہ سارے علمی و ادبی ادارے جن کے مشفق خواجہ رکن رکین رہے، جن کی مختلف مجلسوں اور کمیٹیوں میں شریک ہوکر اپنا قیمتی وقت دے کر، وہ انہیں مشورے دیتے اور ان کی رہبری کرتے رہے، ان پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ خواجہ صاحب کے ناتمام علمی منصوبوں کی تکمیل اور ان کی تحقیقات ادبی کی تدوین کا اہتمام کریں، یہ ان کے ذاتی منصوبے نہیں تھے، اردو زبان و ادب کے ترقیاتی اجتماعی منصوبے تھے، جنہیں بروے کار لانا اور پایہ تکمیل تک پہنچانا، ان اداروں پر ایک طرح سے قرض ہے، ان میں انجمن ترقی اردو، مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیات اردو، مجلس ترقی ادب اور اقبال اکادمی جیسے ادارے شامل ہیں جو سب با وسائل ہیں اور بخوبی ایسا کرسکتے ہیں، ضرورت صرف احساس، نیت اور عزم کی ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور مشاغل کے باوجود انہوں نے ایسے پہاڑ کام کیوں کر انجام دیے؟ میں سوچتا ہوں شاید اس لیے کہ وہ وقت کو اور زندگی کے ایک ایک لمحے کو خدا کی امانت سمجھتے تھے اور اس امانت کو انہوں نے دیانت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ استعمال کیا، اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ ''ہر گزرا ہوا لمحہ ہی انسان کا اصل نامہ اعمال ہوتا ہے، اگر یہ لمحہ بے کار گزرا ہے تو نامہ اعمال پر ایک سیاہ نقطے کا اضافہ ہوجائے گا''، (مکتوب بنام محمد حمزہ فاروقی، ''مخزن''، نمبر ۱۰، ص ۳۶) جو لوگ انہیں جانتے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ مشفق خواجہ نے اپنے قلب شفاف کو سیاہ نقطوں سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔

وہ ایک بے مثال شخص تھے، اپنے اصول و نظریات اور آدرشوں کے ساتھ، اسلام، پاکستان، اردو اور ادب کے ساتھ ان کی وفاداری اور تعہد (Commitment) نہایت محکم، مستحکم اور استوار تھا، وہ ایک مخلص اور بے ریا انسان تھے، سچائی، راستی اور خیر کے قدردان اور علم بردار تھے، شہرت، نمود و نمایش، تصنع اور بناوٹ کو سخت ناپسند کرتے تھے اور انہیں گوارا نہ تھا کہ کوئی شخص خصوصاً ادیب، شاعر یا محقق یہ طرز عمل اختیار کرے۔

پاکستان ہی میں نہیں، بھارت ہی میں نہیں، پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو زبان و ادب کا چرچا ہے:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کے مصداق مشفق خواجہ کا نام زندہ رہے گا اور وہ اردو ادب، اردو تحقیق و تدوین اور اردو طنز و مزاح کے ایک قابل فخر، سپوت کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے اور بقائے دوام کے دربار میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا رہے گا۔

میرے عزیز دوست سجاد میر نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ ''ادبی تحقیق کے میدان میں بڑے نام ہیں، مگر سچ کہتا ہوں، کوئی دوسرا مشفق خواجہ نہیں ہے...... ان جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے، اس شہر ہی میں نہیں، اس ملک میں بھی اور پورے برصغیر میں بھی بلکہ جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں وہاں تک''۔ (نوائے وقت، لاہور، ۲۴ رفروری ۲۰۰۵ء)

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر نجم الاسلام کے نام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے چند غیر مطبوعہ خطوط

از:- جناب رفیق احمد خاں صاحب☆

ڈاکٹر نجم الاسلام کے نام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے ۱۹ مکتوبات خالد محمود کی تالیف ''مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں'' (۱) میں پہلی بار منظر عام پر آچکے ہیں۔

اس مضمون کے ذریعے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے چند غیر مطبوعہ خطوط بہ نام ڈاکٹر نجم الاسلام، اس امر کے پیش نظر شائع کیے جارہے ہیں کہ دونوں فضلا کے مراسم وتعلقات پر مزید روشنی پڑ سکے، علاوہ ازیں بعض علمی اور تحقیقی نکات کی پردہ کشائی ہو اور طرز تحقیق کے بعض پہلو بھی سامنے آسکیں۔

ڈاکٹر نجم الاسلام کے نام ڈاکٹر صاحب کے جو خطوط سامنے آتے ہیں ان میں بیش تر ایسے ہیں، جنھیں بہ جائے خط کے رقعے کا نام دیا جاسکتا ہے (ڈاکٹر نجم الاسلام کے قلم سے بھی اس قسم کے خطوط کے لیے رقعے ہی کا لفظ نکلا ہے)، جو بہ جائے لیٹر پیڈ کے مختلف سائز کے سادہ کاغذوں پر لکھے گئے ہیں اور جنھیں باقاعدہ حوالۂ ڈاک نہیں کیا گیا بلکہ کسی شخص کے توسط سے بھجوایا گیا، اکثر دن، مہینہ اور سال نہیں لکھتے بلکہ صرف سال لکھ دیا کرتے تھے، پیش نظر خطوط میں بھی سوائے ایک خط کے کسی پر مکمل تاریخ درج نہیں، خط نمبر ۸ پر مکمل تاریخ درج ہے اور وہ نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے، یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر نجم الاسلام اپنے نام خطوط پر وصول یابی اور بعض اوقات جوابی خط کی تاریخ درج کردیا کرتے تھے۔

☆شعبہ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جامشورو، پاکستان۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں عدیم الفرصت صاحب علم وفضل تھے، باوجود اپنی دیگر مصروفیات کے خطوط کے جوابات باقاعدگی سے دیا کرتے تھے، یہ بھی ان کی وضع داری کا ایک روشن اور قابل تقلید پہلو تھا، یہی وجہ ہے کہ باوجود ایک شہر میں ہونے کے انھوں نے اپنے عزیز ترین شاگرد سے بھی اسی طرح تعلق قائم رکھا۔

۱۹۵۶ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (یکم جولائی ۱۹۱۲ء-۲۵/ستمبر ۲۰۰۵ء) (۲) صدر شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی کے عہدے پر فائز ہوئے (۳)، یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر نجم الاسلام میرٹھ سے نقل مکانی کرکے پاکستان کے شہر سکھر میں سکونت پذیر ہوئے تھے، ''سکھر میں انھوں نے ایک معروف معیاری ثانوی تعلیم کی انگریزی درس گاہ (۴) میں تدریس کا شغل اختیار کیا تھا اور 'حلقۂ ادب اسلامی'، سکھر کی نشستوں میں اپنے عزیز اور بھائی بدر فاروقی صاحب (۵) کے ساتھ شرکت کرنے لگے تھے'' -(۶)

اسی دوران انھوں نے ۱۹۶۰ء میں شعبہ اردو، سندھ یونی ورسٹی سے اردو میں ایم-اے کے امتحان میں کام یابی حاصل کی (۷)، یقیناً یہی وہ مقام اور موقع ہے کہ ڈاکٹر نجم الاسلام اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ استاد اور شاگرد کا یہ لازوال اور پائیدار رشتہ استوار ہوا اور کئی منزلیں طے کرتا ہوا مثالی شان اختیار کرتا چلا گیا اور باعث ترغیب وتقلید بنا، دونوں حضرات کی آیندہ ملاقات سکھر شہر میں ہوئی، جس کا تذکرہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ (۸)

ڈاکٹر نجم الاسلام ایک مقام پر لکھتے ہیں: ''پاکستان میں اسی نوعیت کا علمی تعلق مخدومی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب سے استوار ہوا جو کم وبیش چالیس برس سے قائم ہے اور جس کا علم سندھ یونی ورسٹی کے حوالے سے بہتوں کو ہے'' -(۹)

ڈاکٹر نجم الاسلام ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد، سندھ منتقل ہوگئے، یہاں ان کی ملازمت کا آغاز ''غزالی ڈگری کالج'' لطیف آباد، حیدرآباد میں لکچرر کی حیثیت سے ہوا، یکم مارچ ۱۹۶۶ء تا ۲۰/نومبر ۱۹۶۹ء بہ حیثیت لکچرر خدمات انجام دیں، ازاں بعد ۲۱/نومبر ۱۹۶۹ء تا ۲۷/جنوری ۱۹۷۰ء پرنسپل کے عہدے پر بھی فائز رہے (۱۰)، اسی اثنا میں انھوں نے شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے زیرنگرانی ''دبستان دہلی کی نثر'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کیا۔(۱۱)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کو اللہ تعالیٰ نے جوہر شناسی کا وصف خاص مرحمت فرمایا تھا، ڈاکٹر نجم الاسلام ان کے فیض نظر کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

''تحقیقی موضوعات اور طریقوں سے میری دل چسپی اور تعلق بہت کچھ اُن ہی (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں) کا فیضان ہے، وہ علم و تحقیق کے ایک روشن مینار ہیں جن سے تلامذہ کے ایک وسیع حلقے نے فیض پایا، میں، آج بھی کہ عمر ۶۵ سال سے تجاوز کر چکی ہے، اپنی تحریریں اشاعت سے پہلے ڈاکٹر صاحب محترم کو مشورۃً دکھا دیتا ہوں اور وہ از راہ کرم التفات فرماتے ہیں''۔ (۱۲)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ڈاکٹر نجم الاسلام سے اپنے تعلق کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے ان سے دلی مسرت کا اظہار ہوتا ہے'' نجم الاسلام صاحب میرٹھ کے رہنے والے تھے، جہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پڑپوتے غلام احمد مدنی (کمشنر) میرے خاص دوست کا مسکن تھا''۔ (۱۳)

یہ رشتہ اپنی ابتدا سے زمانہ آخر تک یعنی جب تک ڈاکٹر نجم الاسلام حیات رہے، قائم و دائم رہا اور کئی منزلیں طے کرتا ہوا دو فضلا کے تعلقات کی صورت اختیار کر گیا، ہر دو جانب سے شفقت و محبت اور عزت و احترام میں کسی زمانے اور کسی مقام پر بھی کمی محسوس نہیں کی گئی بلکہ روز افزوں اضافہ ہی پایا گیا، یہی وجہ ہے کہ جب شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی کی جانب سے سال نامہ رسالہ ''تحقیق'' کا اجرا ۱۹۸۷ء میں ہوا تو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کو رسالے کی ''مجلس مشاورت'' میں نمایاں مقام پر فائز کیا گیا۔

ان خطوط کے مطالعے سے ہم پر واضح ہوگا کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ڈاکٹر نجم الاسلام سے کس طرح مخاطب ہوتے ہیں، ان کا کریمانہ و مشفقانہ رویہ خطوط کے اختتام تک نظر آتا ہے، اسی طرح ڈاکٹر نجم الاسلام آخری دم تک اپنے مشفق و محترم استاد سے نہایت فخر کے ساتھ اکتساب فیض کرتے رہے۔ (۱۴)

۲۸ فروری ۱۹۸۸ء کو ڈاکٹر نجم الاسلام نے ''انجمن ترقی اردو'' کراچی کے ایک اجلاس منعقدہ نیپا آڈیٹوریم میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی سوانح اور خدمات پر ایک مقالہ پڑھا تھا جس کا عنوان تھا'' آں کہ من دانم وہ داند دل من''، اس میں ڈاکٹر صاحب کے متعلق ڈاکٹر نجم الاسلام کے جذبات بھی کسی قدر مترشح ہیں، علاوہ ازیں رسالہ تحقیق کے شماروں میں ڈاکٹر صاحب کی سیرت و

خدمات کے حوالے سے ڈاکٹر نجم الاسلام کی تحریریں نکلی ہیں، ان میں بھی ڈاکٹر صاحب کے متعلق ان کے جذبات و محسوسات ظاہر ہو چکے ہیں، ڈاکٹر نجم الاسلام نے اپنی بعض کتابوں کے حوالے سے بھی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی ترغیب کا تذکرہ نیاز مندانہ کیا ہے۔

اہل علم و نظر اس بات سے بہ خوبی آگاہ ہیں کہ میدان تحقیق میں قدم رکھنے والے شخص کو کس راہ سے گزرنا پڑتا ہے، یہ راہ مسافر سے ایک کٹھن زندگی کا مطالبہ کرتی ہے، اسی جانب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنے ایک مضمون ''تحقیق کے بنیادی لوازم'' میں محقق کی بنیادی ضروریات کے حوالے سے لکھا ہے'' ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق کو بہ طور ایک طرز زندگی اپنانا ہی اولین اور بنیادی اور لازمی شرط ہے''۔ (۱۵)

ڈاکٹر نجم الاسلام نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے طرز زندگی کے متعلق اس طرح لکھا ہے'' علمی اور تحقیقی کاموں کو وسعت اور گہرائی کے ساتھ انجام دینے کے لیے ایک خاص انداز پر زندگی گزارنی پڑتی ہے، دنیا کی بہت سی دل چسپیوں اور ضرورتوں پر علمی اور تحقیقی ضرورتوں کو فوقیت دیے بغیر اس میدان میں کامیابی کا امکان ہی نہیں، دوسرے لفظوں میں یہ ایک خاص طرح کا لائف اسٹائل ہے جسے اختیار کرنا پڑتا ہے، ہمارے بہترین علما اور محققین نے اسی طور پر اپنی زندگیاں گزاری ہیں، ڈاکٹر صاحب کا لائف اسٹائل بھی ان کے علمی و تحقیقی کاموں کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے اور اپنے اندر ایک مثال رکھتا ہے''۔ (۱۶)

یہ امر بھی ظاہر و باہر ہے کہ ڈاکٹر نجم الاسلام نے اپنے استاد کی پیروی میں اسی ڈھنگ سے زندگی گزاری، اخیر عمر میں وہ بھی گوشہ گیر ہو گئے تھے اور ساری توجہ گھر اور تحقیقی کاموں پر مرتکز ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر نجم الاسلام کے متعلق ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے جذبات و خیالات بھی بعض مقامات پر تحریری صورت میں اہل علم حضرات کی نظروں سے گزر چکے ہیں، چند اقتباسات موضوع کی مناسبت سے نقل کیے جاتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب'' سراج البیان'' کا انتساب ڈاکٹر نجم الاسلام کے نام اس دل کش اور پر مغز شعر سے کیا ہے، یہ شعر جہاں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نظر میں ڈاکٹر نجم الاسلام کے مقام و مرتبے کو ظاہر کرتا ہے وہاں وہ ایک بلند مرتبہ استاد کی اپنے لائق و فائق شاگرد کے لیے

دعا ثابت ہوتا ہے۔

۱- ''تہی دیدم سبوے ایں و آں را مئے باقی بہ مینائے دل تست'' (۱۷)

''عزیز گرامی منزلت محترم نجم الاسلام صاحب نے رسالہ تحقیق کے اجرا (۱۹۸۷ء) سے علمی اور ادبی تحقیق کے لیے ایک ایسی داغ بیل ڈالی ہے جو قابل صد تحسین و آفرین ہے۔

اس مفید اور اہم کام کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اس قدر سخت کوشش کی ہے کہ صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ مشک آنست کہ خود ببوید، حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کا اعلا ذوق پیدا کردیا ہے''۔ (۱۸)

۲- ''میرے عزیز شاگرد، فاضل، محقق، اپنے احسانات کو پوشیدہ رکھنے والے، ہر شخص کی خاموشی سے خدمت کرنے والے، صدر شعبہ اردو (سندھ یونی ورسٹی) رہ چکے ہیں، اب بہت بلند پایہ رسالہ ''تحقیق'' شائع کرتے ہیں''۔ (۱۹)

۳- ''آپ کی فاضلانہ کتاب مطالعات ملی، بہت ممنون ہوں، ماشاء اللہ آپ کے تحقیق نو اور ایک مدت تک ہم سب کے لیے موجب افتخار ثابت ہوں گے، مجھ پر آپ کی بڑی عنایات ہیں''۔ (۲۰)

۴- ''وہ مجھ سے بہت قریب تھے، نجم الاسلام صاحب نے بہت محنت اور جاں فشانی سے کام کیا، اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں اور کروڑوں رحمتیں برساتا رہے، آمین۔ ان کے مزاج کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دین و دنیا کے تمام فرائض کو پوری طرح ادا کرنے کے عادی تھے''۔ (۲۱)

ڈاکٹر نجم الاسلام کے انتقال پر ڈاکٹر صاحب نے جو مضمون تحریر کیا تھا، اس کے اختتام پر قطعہ تاریخ ان کے قلبی جذبات کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے، یہی قطعہ تاریخ بعد میں ڈاکٹر نجم الاسلام کے لوح مزار پر نقش کیا گیا۔

۵- ''آہ! دنیا سے اٹھ گئے وہ عزیز سب کے مونس تھے ان کے سب مونس
ان کا بے مثل رسالہ تحقیق رطب ہی رطب، کچھ نہیں یابس
نجم الاسلام فاضل الاکبر ہیں مقیم بہشت خوش مجلس'' (۲۲)

اب مذکورہ خطوط مطالعہ وملاحظے کے لیے آگے ملاحظہ ہوں۔ (باقی)

*****

اضافہ و تصحیح

ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر شمس بدایونی کے مضمون ''مولانا شبلی کے خطوط ......'' کی دوسری قسط مارچ ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی تھی، اس میں ص ۲۰۴ کے آخر میں ''متفرق رسائل و کتب میں منتشر خطوط'' کے عنوان سے جو پیراگراف شروع ہوا ہے، وہ ص ۲۰۵ کی اس عبارت پر ختم ہوا ہے۔

''اس سلسلے میں جو منتشر خطوط میری معلومات میں ہیں وہ حسب ذیل ہیں''، مگر اس کے بعد کی یہ تحریر اب موصول ہوئی ہے، جس کو صفحہ ۲۰۵ کی اوپر تحریر کردہ عبارت کے بعد پڑھیں اور اس کے بعد اسی صفحے پر یہ پڑھیں۔

''سطور گزشتہ میں مولانا شبلی کے جن نئے خطوط کی......''۔ (ض)

مولانا شبلی کے وہ خطوط جو ان کے کسی مجموعے اور خطوط کے انتخابات میں جگہ نہیں پاسکے ہیں، ابھی قابل ذکر تعداد میں موجود ہیں، ماہنامہ معارف کی فائلوں میں متعدد خطوط مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے، معارف کے مستقل عنوان ''آثار علمیہ'' کے تحت بھی مولانا شبلی کے غیر مطبوعہ خطوط شائع کئے گئے، ان سبھی تک رسائی نہیں ہوسکی، اس سلسلے میں جو منتشر خطوط میری معلومات میں ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- بنام شاکر میرٹھی مدیر العصر تعداد خطوط ۱ مشمولہ معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۲۳ء

۲- بنام حافظ احمد علی خاں شوق تعداد خطوط ۱ مشمولہ معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۴۲ء

۳- بنام حکیم اجمل خاں تعداد خطوط ۱ مشمولہ معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۴۲ء

۴- بنام سید ممتاز علی وقار الملک تعداد خطوط ۹ مشمولہ نقوش لاہور اپریل مئی ۱۹۶۸ء

فہرست میں یہ خطوط بنام سید ممتاز علی و نواب وقار الملک کے نام اندراج (خطوط نمبر ج/۱) کیے گئے ہیں اور ان کی تعداد ۱۵ لکھی گئی ہے لیکن دراصل یہ ۹ ہیں، ایک خط محمد علی ناظم ندوہ کا بہ قلم شبلی ہے، اسے بھی شبلی کے خطوط میں محسوب کرلیا گیا ہے، خطوط پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں، لہذا یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کس کے نام کتنے خط ہیں۔

۵- بنام مولانا عبدالباری تعداد خطوط ۸ نقوش خطوط نمبر ج/۲ لاہور اپریل مئی ۱۹۶۸ء۔

۶- بنام مولانا سید عبدالحئی تعداد خطوط ۲ حیات عبدالحئی (مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) دہلی ۱۹۷۰ء ص ۱۶۷، ۱۶۹۔

۷- بنام سرسید احمد خاں تعداد خطوط ۷ اردو ادب دہلی شمارہ ۲ ۱۹۷۱ء۔

۸- بنام مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی تعداد خطوط ۸ معارف اعظم گڈھ ستمبر ۱۹۷۱ء۔

۹- بنام مولانا ارشاد حسین رام پوری تعداد خطوط ۱ فتاوی ارشادیہ بحوالہ حیات شبلی ص ۱۸۱۔

۱۰- بنام نواب مزمل اللہ خاں (علی گڑھ) تعداد خطوط ۳ مزمل نامہ (زیر ترتیب) مرتب مہرالہی۔

(مزمل نامے میں شامل شبلی کے خطوط کی اطلاع جناب ظفر احمد صدیقی (علی گڑھ) نے فون پر دی)

۱۱- بنام لچھمن داس مطبع علی گڑھ تعداد خطوط ۱ سال تحریر ۱۸۹۶ء۔

۱۲- بنام محمد عمر وکیل بنارس تعداد خطوط ۱ سال تحریر ۱۹۰۳ء۔

۱۳- بنام وقار الملک تعداد خطوط ۱ سال تحریر نامعلوم۔

موخر الذکر (۱۱، ۱۲، ۱۳) خطوط میں نے جناب مونس نظامی (مالک نظامی بک ایجنسی بدایوں) کے ذاتی ذخیرے میں دیکھے ہیں، جن کی انہوں نے دور سے مجھے زیارت کرائی، میں صرف ان خطوط کے مکتوب الیہ اور سنہ کو ذہن میں محفوظ رکھنے میں کامیاب رہا، تاریخیں ذہن سے محو ہوگئیں۔

اس طور منتشر خطوط کی تعداد ۴۴ ہوجاتی ہے، جس میں آخری تین خط جو مونس نظامی کی

ملکیت ہیں، ہماری دست رس سے باہر ہیں۔

مطبوعہ مضمون میں ''مکتوبات مشاہیر'' میں نئے خطوط کی تعداد ۱۵ بتائی گئی تھی، یہ تعداد اصلاً ۱۳ ہے (ص: ۲۰۵)، اس طرح مولانا شبلی کے کل دست یاب خطوط کی تعداد ۹۵۷ ہوگئی، منتشر خطوط جن کی تعداد ۴۴ ہے، اگر انہیں بھی شامل کرلیا جائے تو یہ تعداد ۱۰۰۱ ہوجائے گی۔

مارچ کے اسی شمارے میں مولانا وارث ریاضی صاحب کا مکتوب شائع ہوا ہے، اس میں صفحہ ۲۲۲ کی سطر ۱۵، ۱۶ میں حضرت مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کا جو اقتباس درج ہے، اس میں ''منطق کا مسلمہ اصول- لا مشاحۃ فی الاصطلاح'' کو ''لا مناقشۃ'' پڑھا جائے۔

معارف کی ششماہی فہرست جولائی تا دسمبر ۲۰۰۵ء میں موصوف کا نام ''ڈاکٹر محمد وارث ریاضی'' لکھا گیا ہے، ڈاکٹر سے انہوں نے بہت شدت سے اعلان برأت کیا ہے، اب مجھے پہلی بار ان کے صحیح نام ''محمد وارث حسن'' کا علم ہوا۔ ''ض''

☆☆☆☆

اخبار علمیه

اسلامی دنیا کے سب سے مشہور انٹرنیٹ ادارہ ''اسلام آن لائن'' نے رسول اللہ ﷺ اور ان کی سیرت مبارکہ پر مشتمل خصوصی ویب سائٹ شروع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، آن لائن کے وائس پریسیڈنٹ ڈاکٹر علی الدین کے بیان کے مطابق اس ویب پر رسول اللہ ﷺ کے خصائص سیرت و شخصیت کے ساتھ ساتھ آپ پر عائد کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا جائے گا، فی الحال یہ صرف عربی اور انگریزی زبان میں شروع کیا جائے گا، بعد میں دنیا کی اکثر متداول اور عالمی شہرت یافتہ زبانوں میں بھی اسے منتقل کر دیا جائے گا، نائب صدر نے اس نیک مقصد کی تکمیل کے لیے دنیا کے تمام مسلمانوں سے ہر قسم کے تعاون کی اپیل کی ہے، اس ویب کی سرپرستی عالم اسلام کے مشہور فاضل ڈاکٹر یوسف القرضاوی کر رہے ہیں، ان کے خیال میں یہ زکوۃ اور صدقات وغیرہ کا بہترین مصرف ہے۔

ایک طرف ناین الیون اور ڈنمارک اور بعض یورپین ممالک میں رسول اللہ کے توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت نے پوری دنیا میں ہل چل مچادی ہے تو دوسری طرف اس کے بعد مطالعہ اسلام سے دل چسپی اور شغف میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، فرانس کے نیشنل سنٹر برائے کتب کا یہ تازہ انکشاف اس کی بین مثال ہے جس نے بتایا کہ فرانس میں فروخت شدہ سو کتابوں میں ۳۸ قرآن مجید کے ترجمے ہیں، قرآن کا فرانسیسی ترجمہ جان بیرک کا کیا ہوا ہے جو بہت گراں ہونے کے باوجود سب سے زیادہ فروخت ہوا۔

''عرب نیوز'' کی رپورٹ کے مطابق برطانوی افراد عربی زبان و ادب اور اسلامی مطالعات سے خصوصی دل چسپی لے رہے ہیں، نیز غیر مسلم ممالک میں بھی مسلمانوں کے متعلق جاننے اور سمجھنے کے تئیں خاص بیداری اور عام رجحان پیدا ہوا ہے، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ برطانیہ کی ۱۲ا یونی ورسٹیوں میں عربی زبان اور اسلامی مطالعات کو داخل نصاب کیا جارہا ہے اور

عربی سیکھنے کے خواہش مند طلبہ کی تعداد میں بھی روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے، اس لیے عربی بولنے اور پڑھانے والوں کی تقرری کے مواقع نکل رہے ہیں۔

گزشتہ ہفتوں میں پانچ مسلم نمائندہ تنظیموں نے بحرین کے شہر منامامیں رسول اللہ ﷺ کی حمایت و مدافعت میں ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا، جس میں مسلم و غیر مسلم ممالک کے تین سو فضلا نے شرکت کی، اس بڑی کانفرنس کے مصارف کا بار اٹھانے کا سہرا ایک غیر سرکاری ادارہ ICFSP الصلاح کے سر ہے، یونین آف اسلامک اسکالرس اینڈ اسلام ٹوڈے ایک انٹرنیٹ ادارہ ہے جو ایمان اور اسلامی عقائد پر ناروا حملوں کے دفاع کے لیے قائم ہے، اس کے سربراہ اور WAMY کے جنرل سکریٹری نے مخالفین اسلام کے خلاف ہر طرح کے پرتشدد ردعمل کے مظاہرے کے بجائے ان کی سرگرمیوں کے خلاف مدلل مگر پرامن اور موثر اقدامات کرنے کی تلقین کی۔

وسط چین کے علاقہ ہینان میں ایک گاؤں نیہنگ کاؤنٹی واقع ہے، اس کے قریب میں دو ہزار برس پرانے گاؤں ملے ہیں، ہینان انسٹی ٹیوٹ آف کلچرل ریلکس اینڈ آرکیالوجی سے وابستہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ سب گاؤں ۲۰۶ قبل مسیح سے ۲۵ء کے درمیان کے ہوں گے، ان کے اندازے کے مطابق سیلاب سے یہ گاؤں مٹی کے نیچے دب گئے، اس دریافت سے چین میں تقریباً دو ہزار برس قدیم دیہی طرز حیات کا پتہ چلے گا، گاؤں کے زیادہ تر مکانوں کی چھتیں پکی ہیں، کھلے کمرے، پورچ اور غسل خانے بھی پائے گئے ہیں اور ایک کنواں بھی ملا ہے۔

واشنگٹن یونی ورسٹی کے پروفیسر ہینک لیری نے انٹرنیٹ سے متعلق اپنی تحقیق میں کہا ہے کہ اس کی دنیا بھی ویب جاسوسوں کے خطرے سے خالی نہیں ہے، ان کے اندازے کے مطابق دو کروڑ ویب جاسوس کسی بھی کمپیوٹر پروگرام یا ویب سائٹ میں گھس سکتے ہیں جن سے سب سے زیادہ خطرہ دنیا کے اہم لوگوں کی ویب سائٹوں کو ہے، ان ویب جاسوسوں کے ذریعہ کسی بھی ویب سائٹ کی اندرونی یا ذاتی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ جاسوس جس پروگرام میں داخل ہوتے ہیں، ان کو مکمل طور پر برباد اور ان کا پورا نقشہ بدل ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ساتھ ہی انٹرنیٹ کال کر کے ویب سائٹ کے اصلی استعمال کنندگان یا

اس کے مالکوں کا ستیاناس کر سکتے ہیں، ہینک لیری کے بیان کے مطابق انہوں نے اب تک کچھ خاص ویبوں کی تفتیش کی ہے، جس سے متعدد ویبوں میں ویب جاسوسوں کی گھس پیٹ کا علم ہوا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر ان کا اندازہ صحیح ہے تو یہ اصلی مالکوں کے لیے خطرے کا بہت بڑا الارم ہے۔

''نیوز لیٹر'' استنبول کی رپورٹ میں ہے کہ ۲۳ رنومبر ۲۰۰۵ء کو مسلم ورلڈ لیگ کے جنرل سکریٹری ایچ، ای، شیخ محمد ناصر العبودی نے ''اسلامک کنٹریز کلچرل ویک'' کے موقع پر ''سعودیہ عربیہ اور ترکی کے مابین تعلقات'' کے موضوع پر ایک لکچر دیا، اس کا اہتمام استنبول کے مشہور ادارہ ترکش ریلیجس فاؤنڈیشن سے الحاق شدہ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز میں کیا گیا تھا، لکچر کے سامعین میں مورخین، اسکالرس، سماجیات کے ماہرین اور عالمی سیاسات پر گہری نظر رکھنے والے محققین کی کثیر تعداد موجود تھی، ناصر العبودی عالم اسلام کے مقتدر اور مشہور اسکالر ہیں جو سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور اس وقت وہ مسلم ورلڈ لیگ کے ڈپٹی سکریٹری جنرل کے عہدہ پر فائز ہیں، اس سے قبل انہوں نے متعدد اہم مناصب کی ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی انجام دی ہیں، مینجمنٹ آف سائنٹفک انسٹی ٹیوٹ ان بریدہ سے کئی سال وابستہ رہے، تیرہ برس مدینہ یونی ورسٹی کے جنرل سکریٹری رہے، آٹھ برس تک جنرل سکریٹری فار اسلامک دعوہ کی حیثیت سے بھی کام کیا، یہ عہدہ ڈپٹی منسٹر کے درجے کے برابر کا ہوتا ہے، موصوف متعدد برسوں رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری بھی رہے، فن ادب میں ان کی گوناگوں خدمات کے صلے میں انہیں شاہ عبدالعزیز میڈل بھی مل چکا ہے۔

فاؤنڈیشن فار انکریزنگ اسلامک اویرنس امنگ فارن کمیونٹی سے وابستہ قاسم صاحب نے ڈینش میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر ایک کتاب شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، جس کو ڈنمارک اور دوسرے یوروپین ممالک میں مفت تقسیم کیا جائے گا، تاکہ رسول اللہ ﷺ کا توہین آمیز کارٹون شائع کرنے والا یہ ملک آپ ﷺ کے بارے میں واقف ہو اور یہ معلوم کر سکے کہ آپ ﷺ واقعتاً کیا تھے؟ اور آپ ﷺ نے اپنے پیچھے انسانیت کو معراج کمال تک پہونچانے کے لیے کون سے نقوش چھوڑے ہیں۔

ک۔ ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

سورۂ انبیاء کی ایک آیت

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج
اعظم گڈھ

محترم مدیر معارف

السلام علیکم

معارف میں قرآن مجید کی روشنی میں سائنس پر مضامین پڑھ کر خوشی ہوئی مگر جنوری ۲۰۰۶ کے شمارہ میں جناب محبوب الرحمن فاروقی کا مضمون ''سورۂ انبیا کی ایک آیت'' کا ایک جملہ وضاحت طلب ہے اور میرے علم کی حد تک غلط ہے۔

''ہر چیز کی تخلیق ایٹم یا مادے سے ہوئی ہے اور اسی مادے کو تخلیق کی سب سے چھوٹی اکائی مانا گیا تھا لیکن جب خوردبین کے ذریعے ایٹم کو غور سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر ایٹم کے مرکز میں پروٹران اور نیوٹران کے ذرے بھرے ہوئے ہیں جن کے چاروں طرف الیکٹران چکر کاٹ رہے ہیں......''۔ (جنوری ۲۰۰۶ء، ص ۲۹)

ڈالٹن کی اٹامک تھیوری کے مطابق ایٹم مادے کی سب سے چھوٹی اکائی ہے، جس کو مزید تقسیم نہیں کیا جا سکتا، ڈالٹن سے بہت پہلے قدیم تہذیبوں مثلاً ہندوستان میں بھی مادے کی سب سے چھوٹی اکائی کو ''پرمانو'' کہا گیا تھا، یہ تھیوری زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ پائی کیوں کہ جب تھامسن نے ایک ڈسچارج ٹیوب میں جہاں گیس کا دباؤ بہت کم تھا دو الکٹروڈ (Electrode)

کے ذریعے بہت زیادہ وولٹیج (Voltage or Potential difference) اپلائی کیا تو یہ مشاہدہ کیا کہ منفی الکٹروڈ یا کیتھوڈ (Negative Electrode or Cathode) سے بہت زیادہ انرجی کی منفی کرنیں نکلیں اور تیزی سے مثبت الکٹروڈ یا اینوڈ (Positive Electrode or Anode) کی طرف گامزن ہوئیں، ان کو کیتھوڈ رے (Cathode Rays) یا بعد میں الکٹران (Electron) کہا گیا، اس تجربے میں جب پرفوریٹڈ کیتھوڈ (Perforated Cathode) کا استعمال کیا گیا تو پتہ چلا کہ مثبت ذرات اینوڈ سے نکل کر کیتھوڈ سے ہوتے ہوئے نکلے، ان تجربات کے بعد ایٹم کی حیثیت ایک مسلم اکائی کی نہیں رہ گئی بلکہ اب یہ سمجھا جانے لگا کہ ایٹم کے اندر منفی اور مثبت ذرات یا الکٹران اور پروٹران ہوتے ہیں، چوں کہ ایٹم نیوٹرل (Neutral) ہے، اس لیے الکٹران کی تعداد پروٹران کے برابر ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ آخر الکٹران اور پروٹران ایٹم میں کس طرح رہتے ہیں؟

اس سوال کا جواب رودرفورڈ (Rutherford) کے تجربے سے ملا جب انہوں نے ایک سونے کے پتر (Gold Foil) پر الفا کرنیں (α-Rays) بمبارڈ کیں، بہت سی کرنیں تو سونے کے پتر کے پار نکل گئیں جیسے وہ خلا سے گزر رہی ہوں، کچھ کرنیں اپنے راستے سے مڑ گئیں اور کچھ واپس لوٹ گئیں، اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ایٹم کے مرکز میں بہت چھوٹی جگہ پر ایک نیوکلس (Nucleus) ہوتا ہے جس میں سارے پروٹران رہتے ہیں اور اس کے چاروں طرف الکٹران ہوتے ہیں، چوں کہ الفا پارٹیکل یا الفا ریز (α-particle or α-rays) پر مثبت چارج ہوتا ہے، اس لیے یہ کرنیں مرکز کے قریب آکر مڑ گئیں اور جو مرکز سے ٹکرائیں وہ پلٹ گئیں، اس تجربہ سے یہ بھی پتہ چلا کہ ایٹم کا تقریباً سارا وزن پروٹان (Proton) میں ہوتا ہے بعد میں ملیکن آئل ڈراپ میتھڈ (Millikan's Oil drop method) اور e/m (Charge by mass ratio) کی مدد سے الکٹران اور پروٹان کا چارج اور ماس (Charge and Mass) معلوم کیا گیا۔

چونکہ الکٹران بہت تیزی سے نیوکلس کے چاروں طرف چکر کاٹ رہے ہوتے ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ دھیرے دھیرے ان کی انرجی کم ہوتی جائے گی اور یہ اپنا دائرہ کم کرتے ہوئے نیوکلس میں گر جائیں گے اور ایٹم کا خاتمہ ہو جانا چاہیے مگر ایسا نہیں ہوتا، اس وقت تک نیوٹن کی کلاسیکل

میکنیکس (Classical Mechanics) کا زور تھا، مگر جب میکس پلینک (Max Plank) نے کوانٹم میکنیکس (Quantum Mechanics) کا نظریہ پیش کیا تو نیل بور (Neil Bohr) نے اس کی مدد سے ایٹم کا ایک ماڈل پیش کیا، کوانٹم میکنیکس کے مطابق انرجی بہ تدریج حاصل یا دی نہیں جا سکتی بلکہ انرجی کو صرف پیکٹ $E = h\nu$ میں حاصل کیا جا سکتا ہے، یہاں E انرجی، ν فریکونسی (Frequency) اور h پلینکس کانسٹینٹ (Plank's Constant) ہے، بور کے ماڈل میں یہ بتلایا گیا کہ نیوکلس کے چاروں طرف الکٹران صرف مخصوص دائروں میں چکر لگا سکتے ہیں اور نیوکلس سے دور کے دائرے میں جانے کے لیے الکٹران کو ایک پیکٹ (Quanta) انرجی حاصل کرنا ہوتی ہے اور نیوکلس کے قریب دائرے میں آنے کے لیے ایک پیکٹ انرجی باہر نکالنی ہوتی ہے، بور کے ماڈل کو سمرفلڈ نے Modify کیا اور ایک نیا Bohr-Sommerfeld Model وجود میں آیا جہاں Circular orbit کی جگہ Elliptical orbit کا نظریہ پیش کیا گیا۔

ڈیبراگلی (de Broglie) نے بتایا کہ الکٹران نہ صرف ایک ذرے کی طرح ہوتا ہے بلکہ یہ ایک لہر بھی ہے، اس نظریہ کو Wave particle duality کہا گیا، اس کے بعد ہائزن برگ (Heisenberg) نے Uncertainty Principle پیش کیا جس کے مطابق یہ ممکن نہیں کہ کسی الکٹران کی Position اور Momentum کا بیک وقت صحیح پتہ لگایا جا سکے، ان سب نظریوں کو مانتے ہوئے شراڈنگر (Schrodinger) نے Schrodinger Wave equation پیش کیا جس کو حل کرنے پر ہم الکٹران کے انرجی لیول کا پتہ چلا سکتے ہیں، ان انرجی لیول کو کوانٹم (Quantum No.) کہا گیا، Wave Equation کو مزید توسیع ڈیراک (Dirace) وغیرہ نے دیا اور اب اس Wave Equation کے حل کرنے پر چار کوانٹم نمبر ملتے ہیں:

۱- Principal Quantum No.　۲- Orbital Quantum No.

۳- Magnetic Quantum No.　۴- Spin Quantum No.

یہ چاروں کوانٹم نمبر ایسے ہی ہیں جیسے کسی شخص کا پتہ کہ وہ کس ملک (Principal Quantum no.) میں ہے، پھر اس ملک کے کس صوبے (Orbital Quantum no.) میں، پھر

کس ضلع (Magnetic Quantum no) میں اور پھر کس محلے (Spin Quantum no.) میں رہتا ہے یعنی نیوکلس کے گرد الکٹران مخصوص دائرے کے اندر مخصوص Orbital میں چکر لگاتا ہے اور یہ Orbital بھی مختلف شکل کے ہوتے ہیں، جن میں سے بیضوی شکل کے Magnetic Field میں X، Y یا Z axic کے مساوی ہو جاتے ہیں، ان Orbital میں بھی الکٹران اپنی دھری پر Clock Wise یا Anticlock Wise گھوم سکتے ہیں جن کا Spin Quantum no. سے پتہ چلتا ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ ایٹم کا سارا مثبت چارج آخر ایک اتنی چھوٹی سی جگہ یعنی نیوکلس میں کیسے رہ سکتا ہے؟ Proton - Neutron Interaction Theory اور پھر میسان (Meson) کے ذریعے یہ بتلایا گیا کہ پروٹان اپنا چارج نیوٹران، جن کے اوپر کوئی چارج نہیں ہوتا میں بدلتے رہتے ہیں اور میسان نیوکلس کے ذرات کو جوڑنے کے لیے سیمنٹ کی طرح کا کام کرتے ہیں، نیوکلس ہی میں نیوٹرینو اور بیٹا پارٹیکلس (Neutrino and β-particles) بھی پائے جاتے ہیں اور اب تک چھ (۶) طرح کے Quarks کی دریافت ہوئی ہے، ایٹم اور خاص طور سے نیوکلس کے بارے میں کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں۔

کسی چیز کو خوردبین سے دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ Electromagnetic radiation اس پر پڑ کر واپس آئے مگر چوں کہ ایٹم کا سائز بہت کم ہے اس لیے بہت زیادہ انرجی کے radiation کی ضرورت ہوگی یعنی جس کی wave length ایٹم کے حجم سے کم ہو مگر پھر Heisenberg کے Uncertainty Principle کے مطابق یہ زیادہ انرجی کا radiation ایٹم سے ٹکرا کر اس کی حالت میں تغیر پیدا کردے گا، اب ایسی خوردبین کا استعمال ہوتا ہے جس میں خود الکٹران کا استعمال کیا جاتا ہے، اس خوردبین کو Electron microscope کہتے ہیں۔

سلمان سلطان

مطبوعات جدیدہ

مقالات راشدی: از جناب حسام الدین راشدی، مرتبہ جناب غلام محمد لاکھو، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۳۲، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ: انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، جامعہ کراچی، پاکستان۔

قریب اکیس بلند پایہ مضامین کا یہ مجموعہ سندھ پاکستان کے نامور محقق، مورخ اور ادیب و دانشور جناب پیر حسام الدین راشدی مرحوم کے قلم سے ہے، پیر صاحب پاکستان کے ان عالی مرتبہ اہل قلم میں سے تھے جن کی تحریریں اعتبار و استناد کے علاوہ اسلوب کی شائستگی اور شگفتگی کے لیے بھی مقبول و محترم تھیں، سندھی ادب، ہفت مقالہ، دود چراغ محفل، مرزا غازی بیگ ترخان جیسی کتابوں کے علاوہ انہوں نے سندھی اور فارسی زبانوں میں کئی قیمتی کتابیں مرتب کیں، سندھ کی تاریخ اور تذکروں کے متعلق تو ان کو درجہ اختصاص حاصل ہے، ان کے مضامین مختلف علمی رسائل میں شائع ہوتے رہے، ان کی افادیت کے پیش نظر اس کتاب کے لائق مرتب نے ۱۹۴۷ سے ۱۹۸۰ تک کے مضامین کو یکجا کر کے اپنے حسن انتخاب کا ثبوت دیا ہے، پہلا مضمون ''فتاوی عالم گیری کے دو سندھی مولفین اور ان کے اجداد'' کے عنوان سے ہے، یہ ان کی پہلی اردو تحریر تھی اور حسن اتفاق سے یہ ''معارف'' ۱۹۴۷ میں شائع ہوئی، کسی مضمون نگار کی پہلی تحریر کا ''معارف'' میں شائع ہونا یقیناً اس کے کامیاب مستقبل کی ضمانت ہی ہے، پیر صاحب مرحوم کی بقیہ علمی کامرانیاں اس کا ثبوت ہیں، اس مضمون کے علاوہ قریب دس بارہ مضامین کا تعلق بھی سندھ سے ہے، مولانا محب علی سندھی، میر ابو القاسم نمکین، اردو زبان کا اصل مولد سندھ، سندھ کے اردو شعرا، تاریخ سندھ کے مآخذ، غالب اور خادم اور سندھ و ایران کے تعلقات وغیرہ، چند مضامین شخصیات پر ہیں، ان میں کیفی و تاتریہ اور مولانا محمد شفیع لاہوری کے متعلق تحریریں حد درجہ موثر اور ہر دو حضرات کے بارے میں ایسے معلومات پر مشتمل ہیں جو شاید اور کہیں نہ مل سکیں، ان میں خود صاحب تحریر کی شخصیت بھی پوری طرح جلوہ گر ہے، شاہد احمد دہلوی کے متعلق مضمون تو شاہکار ہے جس میں پاکستان بننے کے بعد عوام و خواص کے خوابوں اور پھر ان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی

عجب داستان آگئی ہے کہ ہندوستان سے جانے کے بعد پاکستان میں جائداد، آبرو اور نئے معاشرے میں ایک مقام حاصل کرنے کے جو طریقے اور گر ایجاد کیے گئے تھے، شرفا ان سے قطعی نابلد تھے اس لیے یہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ شاہد صاحب یا اور دوسروں کو جو زخم پہنچے اس کے خون کی سرخی ان کے ایک ایک حرف کی سیاہی میں ملتی ہے، اسی مضمون میں سیماب و آرزو وغیرہ کی کس مپرسی اور ناکام آرزوؤں کا بھی ذکر ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کے استقبال اور پھر ان کے انتقال پر لوگوں کے بالکل متضاد رویہ کا ذکر بھی بڑے کرب سے کیا گیا ہے کہ آنے کے وقت ہزاروں کی تعداد میں اسٹیشن پر جمع ہونا اور دائمی مفارقت کے وقت مشکل سے دو صفوں کے ذریعہ سیرت نگار رسول اعظم ﷺ کو الوداع کہنا، اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ کہانی نواب نثار یار جنگ کی ہے، ایک تعزیتی مضمون میں نیاز فتح پوری کے متعلق پیر صاحب کی عقیدت البتہ غلو آمیز نظر آتی ہے کہ "وہ اردو کے عہد زریں کا آخری نشان تھا" یا یہ کہ "ان کا مطالعہ سمندر کی گہرائیوں کے برابر گہرا اور عمیق تھا"، اس تحریر میں یہ جملے بھی کھٹکتے ہیں کہ "جس کا زخم ایاموں تک رستا رہے گا"، "وہ ایسا رجال تھا الخ"، "آخری عظیم رجال اٹھ گیا" وغیرہ، کتابت کی اور غلطیوں سے مفر کہاں ممکن؟ پیر صاحب مرحوم کی بیسویں برسی پر اس کتاب کی اشاعت واقعی بہترین خراج عقیدت ہے۔

اسلحے، سکّے اور ڈاک ٹکٹ میں اسلامیات: از جناب واحد نظیر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۳۰۴، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: سلسلہ خانقاہ منعمیہ قمریہ، متین گھاٹ، پٹنہ سٹی اور بک ایمپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔

کتاب کے نام سے اس کی معنویت اور اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، لائق مصنف نے اپنی ہمت و محنت کے اظہار کے لیے ایسا میدان منتخب کیا جو عام علمی کاموں سے دور اور الگ ہی کہا جائے گا، اسلحہ جات، سکے اور موجودہ دور میں ڈاک ٹکٹوں کی تاریخی اہمیت کا جواز تو نظر آتا ہے لیکن ثقافت اسلامیہ سے ان کے رشتوں کو جس طرح اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ واقعی تعریف کے لائق ہے، مصنف کی سلامت طبع کی داد بھی ضروری ہے کہ انہوں نے ثقافت اور تمدن کی بحث میں یقین سے کہا کہ "اسلامیات اس مکمل ثقافت کا دوسرا نام ہے جو مشیت الٰہی کی قائل، تابع اور فلاح انسانی کی خواہاں ہو"، اس دعوے کو انہوں نے بڑے دل چسپ انداز سے بہ دلائل

ثابت کیا، اسلحہ جات، علم، سکے، کرنسی نوٹ، مہر، ڈاک ٹکٹ، نقشہ جات، اسکیچ، آٹوگراف، غرض ثقافت و تمدن کے ان مظاہر میں انہوں نے اسلامیات کا عکس اور نقش بڑی خوبی سے تلاش کیا، اس تحقیق و دیدہ ریزی کا مقصد بھی بڑا مبارک ہے کہ فنی اور فکری لحاظ سے ان حقائق کی بازیافت کی جائے جو امن و اتحاد اخوت و مساوات اور سکون و سلامتی کا پیغام دیتے ہیں، نوجوان مصنف کی ہر سطر سے ان کی محنت کی شہادت ملتی ہے، یہ کہنا بجا ہے کہ "یہ ایک قاموسی مقالہ ہے" اور اپنے موضوع پر شاید یہ "واحد نظیر" ہے۔

عہد نبوی کے غزوات و سرایا اور شہدائے اسلام: از جناب مولانا انوار احمد اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۳۲۰، قیمت درج نہیں، پتہ: دار الکتاب دیوبند، مکتبہ نعیمیہ دیوبند اور مصنف کا پتہ: جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڈھ۔

عہد نبوی کے غزوات و سرایا اور ان میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حضرات صحابہ کرامؓ کا مقصد وحید صرف اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا اور اس کے دین کی سربلندی اور اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کا حصول تھا، جہاد کی حقیقت یہی ہے اور راہ جہاد میں متاع جاں نذر کرنے کا اصل جذبہ بھی یہی ہے، اس موضوع پر مواد و معلومات کی کمی نہیں، تاہم حوصلہ مندوں کے لیے تحقیق مزید کے در، بند بھی نہیں ہیں، یہ کتاب بھی اسی حوصلہ مندی کا ایک نمونہ ہے جس میں ایسے صحابہ کرامؓ کا ذکر بھی آگیا ہے جن کے اسمائے گرامی سے، بہت سی کتابوں کے صفحات خالی ہیں، ان حضرات کے علاوہ کوشش کی گئی ہے کہ غزوات و سرایا کا پورا نقشہ و پس منظر بھی تفصیل سے آجائے اور اس کوشش میں لائق مرتب کامیاب نظر آتے ہیں، جہاد کی فضیلت و ضرورت اور غزوات و سرایا کے وقوع کی تفصیل کے بعد ہر غزوہ و سریہ کے شہدا کے حالات کا مستند مآخذ کی مدد سے ذکر کیا گیا ہے، تحریر سلیس اور آسان ہے، جس کی وجہ سے یہ علما کے علاوہ طلبہ اور عام قاری کے لیے بھی مفید ہوگئی ہے۔

حج اور عمرہ فلاحی کے ہمراہ: از جناب مولانا محمد اقبال فلاحی خان پوری، اردو ترجمہ: جناب مولانا رشید ابراہیم خان پوری، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت مناسب، صفحات: ۳۵۸، قیمت درج نہیں، پتہ: جامعہ علوم القرآن جمبوسر، بھروچ، گجرات۔

حج بیت اللہ اور اس کے سفر، مشکلات سفر، ادائے مناسک اور مسائل فقہیہ کے باب

میں بے شمار کتابیں اور مضامین آتے رہتے ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں ذاتی تجربات کی روشنی میں جدید حالات وضروریات اور مسائل کو پیش نظر رکھ کر حجاج کے لیے ضروری، مفید اور آسان طریقوں کو بیان کیا گیا ہے، گویا مسائل کے علاوہ حج کے لیے یہ ایک راہ نما بھی ہے، کتاب اصلاً گجراتی زبان میں لکھی گئی تھی، اس کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی اور اسی افادیت ومقبولیت کی وجہ سے اب اس کو اردو میں بھی منتقل کر دیا گیا، مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدم قدم پر صحیح رہنمائی کی گئی ہے اور یہ توقع بجا ہے کہ عازمین حج اگر اس کتاب کو حج سے پہلے اور حج کے دوران بھی اگر ساتھ رکھیں تو ان کے لیے آسانی کا ذریعہ ہوگی۔

[illegible] ہند کی داستان: از جناب وسیم احمد سعید، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۲۳۰، قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: وسیم احمد سعید ۱۶۸-بی سیکٹر نمبر ۱۴، نویڈا۔

[illegible] دل چسپ کتاب کے مصنف کے بہ قول ایسی کوئی کتاب نہیں ملی جس میں ایک ساتھ بے شمار شہروں کی تاریخی حیثیت کو سمیٹا گیا ہو، یہ کتاب اسی احساس کا نتیجہ ہے جس میں آگرے سے مرشد آباد تک قریب ساٹھ ان شہروں کی تاریخ یکجا کی گئی ہے جو کبھی اسلامی ہند کی عظمت کے نشان تھے، یہ احساس بھی قابل قدر ہے کہ ایک طرف تو زمین دوز تاریخ کو برآمد کیا جارہا ہے لیکن دوسری جانب زندہ جاوید تاریخ کو فراموش کرنے کی دانستہ کوششیں بھی جاری ہیں، فاضل مصنف نے بڑی محنت سے ہر اس شہر اور بستی کی تاریخ جامعیت وخصوصیت کے لحاظ سے مرتب کر دی جس کا تعلق کسی درجہ بھی اسلامی تاریخ سے رہا ہے، البتہ دکن کا جدا ذکر ہے جو کتاب کے موضوع سے الگ نظر آتا ہے، اسلام آباد کے نام سے انہوں نے تین بستیوں کا ذکر کیا ہے لیکن بھوپال کے نزدیک اسلام نگر کا ذکر رہ گیا جو اپنی عمارتوں کے حسن وجدت کی وجہ سے ممتاز ہے، بھوپال کے ضمن میں بھی اس کا ذکر نہیں، ظاہر ہے یہ فہرست چند خاص اور بڑے شہروں تک محدود ہے ورنہ قصبات اور ذیلی شہروں کی تفصیل بھی کم دل چسپ نہیں، مانڈو، برہان پور جیسے شہروں کے علاوہ یوپی، بہار، پنجاب، مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر اور آندھرا پردیش کی ایسی بے شمار بستیاں ہیں جن کی تاریخی اہمیت کم نہیں، یہ کہنا درست ہے کہ یہ کام وقت طلب ہے لیکن رائیگاں بہر حال نہیں۔

ع۔ س

☆☆☆☆☆